جلد ٦٨ دسمبر ١٩٦٧ء عدد ۴

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مُرتّبہ

سیّد ابُوالاعلیٰ مودُودی

سالانہ چندہ: سات روپے
قیمت فی پرچہ: ۷۵ پیسے

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ضبطِ تولید — ایک معاشی ضرورت ہے

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ یہ — خوش حالی وصحت مندی کا زینہ ہے

کچھ لوگ اس کے برعکس رائے رکھتے ہیں

لیکن شریعت اس کے بارے میں کیا کہتی ہے ؟

شریعت کا نقطۂ نظر

مفتی محمد یوسف

استاذ. جامعہ اسلامیہ، اکوڑہ خٹک (پشاور) نے

ضبطِ تولید کی شرعی حیثیت

میں

نہایت واضح اور مدلل طریقہ پر پیش کیا ہے

جس میں فریقین کے دلائل کا نہایت علمی انداز میں جائزہ لیا گیا ہے۔

اپنی آئندہ نسل کے بارے میں فیصلہ کرنے سے پہلے اس کا مطالعہ ضرور کیجیے

قیمت اعلیٰ ایڈیشن مع پلاسٹک کور: ۳/۷۵ روپئے — صفحات ۱۵۴ — سستا ایڈیشن: ۱/۷۵ روپیہ

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ

۱۳۔ ای، شاہ عالم مارکٹ، لاہور

۱۶۔ بیت المکرم (پہلی منزل)، ڈھاکہ

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۶۸	دسمبر ۱۹۶۷ء	عدد ۴

سالانہ چندہ	ماہنامہ ترجمان القرآن	قیمت فی پرچہ
سات روپے	۵۔اے ذیلدار پارک، اچھرہ۔ لاہور	۷۵ پیسے

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس لاہور میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن، اچھرہ۔ لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

جس طرح ترنگ کے عالم میں کیا ہوا کسی فرد کا ایک عمل یا لاشعوری کے عالم میں اُس کی زبان سے نکلا ہوا ایک جملہ اُس کے افکار و نظریات کی صحیح ترجمانی نہیں کر سکتا بالکل اسی طرح کسی نظامِ حیات کا کوئی دُور دراز کا مختصر سا گوشہ اُس کے خط و خال کو پُوری طرح نمایاں نہیں کر سکتا۔ انسان کو اگر صحیح طور پر سمجھنے کے لیے اس کے مزاج کا جاننا ضروری ہے تو کسی نظامِ حیات سے متعلق بھی صحیح واقفیت حاصل کرنے کے لیے اُس کے مزاج کو سمجھنا لابدی ہے۔ مختلف نظامہائے حیات کی قدر و قیمت کو صحیح طور پر متعین کرنے میں انسان نے جو ٹھوکریں کھائی ہیں اُن کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ وہ اُن کے ایک آدھ پہلو کو سامنے رکھ کر اُن کے بارے میں غلط اندازے کر لیتا ہے اور اُس روح اور اُس مزاج کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا جس کی وہ پہلو نمائندگی کرتا ہے۔

آپ اسلام، اشتراکیت اور سرمایہ داری ان تینوں نظاموں کا اگر سرسری سا جائزہ لیں تو آپ کو ان میں کئی ایک چیزیں مشترک نظر آئیں گی۔ مثلاً اسلام فرد کی آزادی کا علمبردار ہے اور سرمایہ داری بھی اسی اصول کی دعویدار ہے۔ اسی طرح اسلام انسان اور انسان کے درمیان مساوات کا قائل ہے اور اشتراکیت بھی اسی نظریہ کے حق میں ہے لیکن اشتراک کے ان خارجی مظاہر کے پسِ پردہ جب ہم جھانک کر دیکھتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ محض فریب نظر ہے۔

سرمایہ داری اور اشتراکیت میں تو ممکن ہے بعض پہلوؤں میں اختلاف ہونے کے باوجود اتحاد و اتفاق ہو مگر جہاں تک اسلام کا تعلق ہے یہ بات پُورے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ یہ نظامِ زندگی اپنی اساس اپنے

مزاج، اپنے خوب و ناخوب کے پیمانوں، اپنے مقاصد اور منہاج، الغرض روح سے لے کر فکر و عمل کی معمولی سے معمولی جزئیات تک زندگی کے ان تمام نظاموں سے یکسر مختلف ہے جن کی بنیاد مادیت پر رکھی گئی خواہ وہ اشتراکیت ہو یا سرمایہ داری یا کوئی اور نظام۔

اسلام میں کسی شے یا فعل کے اچھے یا بُرے ہونے کا واحد معیار اُس کا اخلاقی فائدہ اور نقصان ہے اور اسی معیار کے مطابق اُس کی اہمیت متعین ہوتی ہے۔ چونکہ انسان افعال و اعمال کے اخلاقی اثرات و نتائج کا جو بڑے گہرے بھی ہوتے ہیں اور دُور رس بھی، خود پوری طرح اندازہ کرنے سے قاصر ہے اس لیے ان کی اخلاقی جانچ اور پرکھ کے لیے اُسے لازمی طور پر اُس ذات کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے جو اس پوری کائنات کی خالق اور مالک ہونے کی وجہ سے افعال و اعمال کے محسوس اور غیر محسوس مرئی اور غیر مرئی اثرات پر نہ صرف پوری نظر رکھتی ہے بلکہ ان کی صحیح قدر و قیمت بھی متعین کر سکتی ہے۔

اسلام کے برعکس اشتراکیت اور سرمایہ داری دونوں میں انسان خود کسی چیز یا عمل کے اچھے اور بُرے پہلو متعین کرتا ہے اور خود اُس کی افادیت یا ضرر رسانی کا اندازہ کرتا ہے اس لیے وہ اس کے اُن اخلاقی پہلوؤں کی اہمیت سمجھنے سے ہمیشہ قاصر رہتا ہے جو خالق کائنات کے سامنے ہوتے ہیں۔

دنیا کی جو قومیں بھی ان نظاموں کی لپیٹ میں آئیں انہیں مجبوراً اس نظام کے تحت زندگی گزارنا پڑی جس کا رہنما اصول یہ تھا کہ کسی شے یا عمل میں جو کچھ خیر اور بھلائی ہے وہ اسی نقطۂ نظر سے ہے کہ مادّی اعتبار سے وہ کس قدر مفید اور کارآمد ہے۔ اور یہ وہ اصول ہے جس میں اشتراکیت اور سرمایہ داری ایک دوسرے سے پوری طرح متفق اور متحد ہیں۔

اشتراکیت کے علمبردار سرمایہ داری کے خلاف مختلف باتیں کر کے لوگوں کو یہ باور کروانا چاہتے ہیں کہ ان کے مقاصد ایک دوسرے سے مختلف ہیں مگر یہ محض فریب نظر ہے۔ ان کے اندر جو کچھ اختلاف ہے وہ طرزِ عمل اور طریق کار کا ہے جہاں تک دونوں کے بنیادی مقاصد کا تعلق ہے اُن میں قطعاً کوئی اختلاف

نہیں کیونکہ دونوں مادّی سُود و زیاں کو کسی چیز کے حلال و حرام اور کسی فعل کے جائز و ناجائز ہونے کا واحد معیار قرار دیتے ہیں۔

چین کے اندر اشتراکی تجربے کے بارے میں لوگوں کو کتنی خوش فہمیاں تھیں۔ اس انقلاب کے داعی دنیا کو یہ تاثر دینے کی برابر کوشش کر رہے ہیں کہ مذہب کے معاملے میں روس نے جو عاقبت نا اندیشانہ روش اختیار کی تھی ہم اُس سے ہمیشہ اعراض کریں گے اور لوگوں کو یہ آزادی دیں گے کہ وہ اپنے مذہبی امُور کو جس طرح چاہیں طے کریں اور مذہب نے اُن پر جو ذمہ داریاں ڈالی ہیں انہیں اپنے ذوق کے مطابق پُورا کریں۔ چنانچہ ایک وسیع پراپیگنڈے کے ذریعہ دنیا کی مذہب پسند قوموں خصوصاً مسلمانوں کے ذہن میں یہ بات بٹھانے کے لیے پُوری تگ و دو کی جا رہی ہے کہ اشتراکیت کا جو نسخہ اہلِ چین نے تیار کیا ہے وہ مذہب کے لیے کسی اعتبار سے بھی زہر نہیں بلکہ قند ہے اور مسلمانوں کو بڑی رغبت کے ساتھ اس سے استفادہ کرنا چاہیے۔

پروپیگنڈے کی اس فضا میں جب ہر طرف چینی اشتراکیت کے حق میں نعرے بلند ہو رہے ہوں اور خود اہلِ چین ایک نئے تصورِ حیات کو دیانتداری کے ساتھ اپنا کر دنیا کی ایک بہت بڑی قوت بنتے جا رہے ہوں اس انقلاب کے علمبرداروں کے کسی دعوے کی تردید کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے مگر جوش و خروش کے اس عالم میں بھی جب ہر طرف چین کی مدح سرائی ہو رہی ہے اور لوگوں کو یہ باور کرایا جا رہا ہے کہ یہ سرزمین ہر قسم کے ظلم و جور سے پاک ہے، یہاں کسی قسم کے استحصال کا نام و نشان نہیں، یہاں ہر فرد اور گروہ کے حقوق پُوری طرح محفوظ ہیں، کبھی کبھی ایسی خبریں اخبارات میں شائع ہوتی رہتی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ چین کے اشتراکی وسیع النظری اور احترامِ انسانیت کے بلند بانگ دعووں کے باوجود کسی ایسے نظامِ حیات کا وجود گوارا نہیں کر سکتے جو خیر و شر کا معیار مادّی نفع و نقصان کی بجائے اخلاق و روحانیت کو بنائے۔ چنانچہ کویت کے مشہور مجلّہ "الوعی الاسلامی" نے سُرخ ثقافتی انقلاب کا جاری کردہ وہ اعلان شائع کیا ہے جس میں مسلمانوں اور ان کے عقائد کے بارے میں پالیسی کا اظہار کیا گیا ہے۔ یہ اعلان ملّت کے ہر اُس فرزند کے پیشِ نظر رہنا چاہیے جو ملّت سے کچھ بھی وابستگی رکھتا ہے۔

"اے سرخ فوج کے سپاہیو! تمہیں سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا چاہیے۔ وہ لوگ جنہوں نے ہمارے خون بہائے، ہمارے گوشت نوچے اور ہماری ہڈیاں چبائیں، اب وقت آگیا ہے کہ ہم اُن کے خون بہائیں اور اُن کے گوشت نوچیں۔ اے سُرخ فوج کے سپاہیو! یہ ناممکن ہے کہ ہم اپنے دشمنوں کو بھاگنے دیں۔ آج کے بعد ہم پر فرض عائد ہوتا ہے کہ ہم اپنے دشمنوں پر خصوصاً چھپے ہوئے دشمنوں پر یعنی مسلمانوں پر پوری قوت کے ساتھ جھپٹیں۔ کیونکہ یہ لوگ دین کے پردے میں ہماری جماعت اور ہمارے ملک کی مخالفت کرتے رہے ہیں۔ انہوں نے مساجد اور درس گاہوں کے اندر گھس کر اس استعمار کی چاکری کی ہے جو ہمارے ملک، ہماری تنظیم اور ہمارے قائد ماؤزے تنگ کے خلاف صف آرا رہا ہے۔"

پھر مسلمانوں کو مخاطب کر کے یہ کہا جاتا ہے:

"اے مسلمانو! گوشِ ہوش سے سُن لو! آج کے بعد تمہیں اس بات کی ہرگز ہرگز اجازت نہ دی جائے گی کہ تم اپنے چہروں پر دین کا نقاب ڈال سکو ورنہ ہم تمہیں جلا وطن کر دیں گے یا نیست و نابود کر دیں گے۔ آج کے بعد تمہیں اس بات کی اجازت نہیں دی جائے گی کہ تم گائے کا گوشت کھاؤ کیونکہ گائے اس ملک میں اشتراکیت کے لیے مفید ہے۔ اب تمہیں خنزیر کا گوشت کھانا چاہیے۔ آج کے بعد تمہیں اس بات کی اجازت نہیں دی جا سکتی کہ تم اپنے اوقات نمازوں میں ضائع کرو اور تم عربی زبان میں گفتگو کرو، وہ زبان جو چینی زبان سے مختلف ہے۔ تمہیں اس بات کی بھی اجازت نہیں دی جاسکتی کہ قرآن کی تلاوت کرو جسے تم کتابِ مقدس کہتے ہو۔

اَے مسلمانو! پورے غور سے سُن لو! تمہیں اپنے مدارس اور مساجد کو ڈھانا ہوگا، اپنی اسلامی تنظیمات کو توڑنا ہوگا، قرآن مجید کو جلانا ہوگا۔ رشتہ مناکحت کے جو اصول تم نے وضع کر رکھے ہیں انہیں ختم کرنا ہوگا، نماز کو خیرباد اور ختنے سے اجتناب کرنا ہوگا۔ تمہیں اب ماؤزے تنگ کے افکار و نظریات کو اپنانا ہوگا اور اگر تم ان چیزوں سے باز نہ آئے تو پھر تمہیں مٹا دیا جائے گا۔ ہم

پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ ہم دینی چوہوں کے سارے بلوں کو ملیامیٹ کر دیں۔ اور اگر تم اپنی روش سے باز نہ آئے تو تمہیں بھی ان کے ساتھ ہی برباد کر دیں۔ عظیم ثقافتی انقلاب زندہ باد! پائندہ باد!

ہمیں معلوم ہے کہ اشتراکیت کے حامی اپنے عام قاعدے کے مطابق اس اعلان کو بھی استعمار کا غلط پراپیگنڈا کہہ کر فریب خوردہ مسلمانوں کے حسنِ ظن کو قائم رکھنے کی کوشش کریں گے مگر جو شخص اشتراکیت کے مزاج سے معمولی واقفیت بھی رکھتا ہے وہ اس بات کو اچھی طرح جانتا ہے کہ اس اعلان میں کوئی ایک چیز بھی ایسی نہیں جسے اَن ہونی کہا جا سکے۔ یہ اعلان اشتراکیت کے تقاضوں کے بالکل عین مطابق ہے بلکہ اگر اس سے کوئی مختلف بات کی جاتی تو ہمیں اُس پر حیرت ہوتی۔ یہ بات بالکل درست ہے کہ مسلمان جس نظریۂ حیات کے علمبردار ہیں وہ اشتراکیت سے ہر مرحلے پر متصادم ہے اور وہ مسلمان رہ کر کبھی بھی کسی ایسے نظامِ زندگی کو اپنا نہیں سکتے جو مادی اقدار پر قائم کیا گیا ہو۔ انہیں اشتراکیت اور اسلام میں سے بہرحال ایک کو منتخب کرنا ہوگا۔ اگر وہ اشتراکیت کے اپنانے میں مخلص ہیں تو پھر اسلام سے ان کی محبت کا دعویٰ بالکل جھوٹا ہے اگر وہ اسلام سے سچی وابستگی رکھتے ہیں تو پھر اشتراکیت سے اُن کا تعلق بالکل فضول اور لغو چیز ہے۔ اس بنا پر اشتراکیت کے داعیوں نے بالکل صحیح کہا ہے کہ وہ اپنے متعلق فیصلہ کر لیں کہ وہ کس نظام سے وابستہ رہنا چاہتے ہیں۔

دوسرے اب اگر انہیں چین میں زندگی گزارنا ہے تو پھر انہیں اپنے نقطۂ نظر میں بنیادی تبدیلی کرنا چاہیے اور حرام و حلال اور جائز و ناجائز کے اسلامی تصورات کو ختم کر کے ان تصورات کو اپنانا چاہیے جو اشتراکیت نے انہیں دیئے ہیں۔ گائے ملکی معیشت کے لیے خنزیر سے زیادہ مفید ہے اس لیے گائے کے گوشت کے استعمال سے دستکش رہ کر سؤر کا گوشت استعمال کرنا چاہیے۔

نماز دینی اور روحانی اعتبار سے خواہ کتنی ہی ضروری عبادت ہو اور اس کے ادا نہ کرنے سے اللہ کے بندوں کو خواہ کتنا نقصان پہنچتا ہو لیکن انہیں اسے ترک کر دینا چاہیے کیونکہ اس کے ادا کرنے میں جو وقت صرف ہوتا ہے وہ مادی لحاظ سے نتیجہ خیز نظر نہیں آتا اس لیے اشتراکی نظام میں اس عمل کو قطعاً برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا خاتمہ تو اول روز ہی سے ہو جانا چاہیے تھا لیکن اگر اسے کچھ مدت تک بعض مصالح کے

کے تحت گوارا کیا جاتا رہا ہے تو اب اسے لازمی طور پر ختم کر دینا چاہیے۔

یہی حال قرآن مجید کا ہے۔ یہ ایک ایسی کتاب ہے جو اخلاق اور روحانیت کو انسانی افعال و اعمال کی بنیاد بنانے کی دعوت دیتی ہے اور یہ چیز اشتراکیت کے اساسی تصورات کی ضد ہے لہٰذا جب تک مسلمان اس کتاب اور اس کی مقدس تعلیمات کو چھوڑ کر مارکس، لینن اور ماؤزے تنگ کی تعلیمات کو نہیں اپنانے اس وقت تک وہ چین کے سچے خیر خواہ نہیں قرار دیئے جا سکتے۔ اشتراکیت کے ساتھ ان کے اخلاص کا تقاضا یہ ہے کہ وہ نہ صرف قرآن کو پسِ پشت ڈال کر ماؤزے تنگ کی تعلیمات پر ایمان لائیں بلکہ قرآن مجید نے اوامر و نواہی کا جو نظام دیا ہے اس کی دل و جان سے تکذیب کریں، ان اخلاقی پابندیوں کے خلاف علمِ بغاوت بلند کریں جو اسلام نے زندگی کے مختلف شعبوں میں عائد کر رکھی ہیں۔

فکر و نگاہ کی اس ہمہ گیر تبدیلی کا تقاضا صرف اشتراکیت ہی نہیں کرتی بلکہ دنیا کا ہر وہ نظام کرتا ہے جو انسانی فکر و عمل کی اپنی کوئی الگ اساس رکھتا ہو۔ یہ بات البتہ درست ہے کہ کوئی نظام یہ تبدیلی قوت کے زور سے لاتا ہے اور کوئی حالات کے دباؤ سے انسان کے افکار و نظریات اور احساسات و جذبات بدل کر رکھ دیتا ہے۔ سرمایہ داری نے اشتراکیت کے برعکس دوسری راہ اختیار کی ہے۔ منزل دونوں کی ایک ہے مگر راہیں مختلف۔ سرمایہ داری کا طریقِ کار یہ ہے کہ لوگوں کے دین و ایمان سے براہِ راست تعارض نہ کیا جائے اور نہ انہیں مذہب اور دین کو ترک کرنے کی دعوت دی جائے مگر اجتماعی زندگی کو خالص الحاد کی بنیادوں پر تعمیر کر کے ایک انسان کے لیے مذہب کی پیروی قریب قریب ناممکن بنا دی جائے اور پھر تعلیم اور نشر و اشاعت کے ذریعہ اُسے اس بات کا قائل کیا جائے کہ وہ مذہب کے جن افکار و نظریات کو سینے سے لگائے ہوئے ہے وہ بالکل بوسیدہ اور ناکارہ ہیں۔ راہوارِ زمانہ نے انہیں گرد سمجھ کر پیچھے پھینک دیا ہے اس لیے اس کا اب انہیں اپنانے پر مصر ہونا بالکل حماقت ہے جس کی عقل، تجربہ اور مشاہدہ کوئی بھی تصدیق نہیں کرتا۔ مسلمان یا دنیا کی دوسری مذہب پسند قومیں خواہ دین کو اشتراکیت کی جکڑ بندیوں اور ہمہ مقتدر ریاست کی قوتِ قاہرہ سے خوفزدہ ہو کر ترک کریں یا سرمایہ دارانہ فریب کاریوں کے زیرِ اثر آکر پسِ پشت ڈالیں

مگر نتائج کے اعتبار سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ اشتراکیت میں قانون کا دباؤ لوگوں کو دین سے منحرف کرکے اُن کی زندگی خالص مادہ پرستانہ بنیادوں پر تعمیر کرتا ہے اور سرمایہ داری میں وقت کے تقاضوں کی آڑ لے کر لوگوں کے ایمان سلب کیے جاتے ہیں اور اس کی جگہ الحاد کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔ آپ اگر مذہب سے انحراف کی پوری تاریخ کا مطالعہ کریں تو آپ کو یہی دو رجحانات کسی نہ کسی صورت میں نظر آئیں گے۔

ان دو رجحانات کا بھی جب ہم مزید تجزیہ کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ ان کے مظاہر ایک دوسرے سے مختلف ہیں مگر حقیقت کے اعتبار سے یہ ایک ہی تحریک کے دو رُخ ہیں اور وہ تحریک یہ ہے کہ کسی شے اور فعل کے محمود و مذموم، حق اور باطل یا حلال و حرام کا فیصلہ اُس کے مادی فوائد اور نقصانات کے مطابق کیا جائے۔ اگر کفر ایک ملت ہے تو کافرانہ افکار و نظریات بھی اپنے وسیع تر اختلافات کے باوجود بنیادی طور پر ایک ہیں کیونکہ یہ سب ایک ہی چشمہ سے پھوٹتے اور غذا حاصل کرتے ہیں۔ جس اصول کو مارکس تاریخ کی مادی تعبیر کہتا ہے وہ دراصل یہی ہے کہ انسانی افعال و اعمال کا منبع و ماخذ صرف مادی اسباب و محرکات کو قرار دیا جائے اور پھر ان کے مطابق انسانی جدوجہد کی پوری تاریخ کی تعبیر کی جاتے۔

سرمایہ داروں نے اس تحریک کو کئی ایک ناموں سے موسوم کیا ہے مثلاً عقلیت پرستی، افادیت پسندی یا مادیت۔ ان سب میں بظاہر اختلافات کے کئی ایک پہلو ہیں لیکن آپ ان کی جڑوں میں اُتر کر دیکھیں تو آپ پر یہ حقیقت خود بخود منکشف ہو جائے گی کہ وہ سب کی سب ایک ہی زمین سے خوراک اور توانائی حاصل کرتی ہیں۔

یہ سب تحریکات انسانی زندگی پر کس طرح اثر انداز ہو کر ایک جیسے نتائج مرتب کرتی ہیں یہ ایک دلچسپ بحث ہے جسے ان صفحات میں پوری طرح سمیٹا نہیں جا سکتا، میں صرف اس کی چند ایک مثالیں پیش کرتا ہوں۔

یورپ میں جس تحریک کو اصلاحِ مذہب کہا جاتا ہے وہ درحقیقت تجدیدِ مذہب کی کوئی تحریک نہ تھی بلکہ اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ انسانی افعال و اعمال کی روحانی اور اخلاقی بنیادوں کو منہدم کرکے انہیں مادی بنیادوں پر استوار کیا جائے۔ یہ تحریک مذہب کے خلاف گہری سازش تھی جس نے بڑی فریب کاری کے ساتھ

اس مقصد کو حاصل کیا۔ سب سے پہلے انسان کے ذہن میں یہ بات بٹھائی گئی کہ مذہبی تعلیمات عقل کے عین مطابق ہونی چاہییں مگر عقل کے بارے میں یہ طے کر لیا گیا کہ جو چیز تجربہ اور مشاہدہ میں آ کر مفید ثابت ہو جائے وہ عقل کے مطابق ہے۔ پھر افادیت کا معیار یہ قائم کیا گیا کہ وہ چیز مادی نقطۂ نظر سے فائدہ مند ہو۔ اس طرح چند سالوں میں صحیح مذہب کی جان پہچان یہ ہو گئی کہ اس کی تعلیمات انسانوں کے لیے مادی نقطۂ نظر سے کار آمد ہوں اور جو اصول بھی اس راستے میں حائل ہوتا ہو وہ کم عقلی بلکہ جہالت ہے جس سے جلد از جلد چھٹکارا حاصل کرنا چاہیے۔

صنعتی انقلاب کے بعد یورپ کی قوموں کو سرمایہ کی ایک کثیر مقدار درکار تھی اور اپنے مال کی کھپت کے لیے اور خام پیداوار کے حصول کے لیے منڈیوں کی تلاش بھی تھی۔ سرمایہ دار کو اپنی بالاتر قوت کا پورا احساس ہو چکا تھا اور وہ اس سے پورا پورا فائدہ اٹھا کر سب سے پہلے اپنے مفادات بالکل محفوظ کرنا چاہتا تھا چنانچہ وہ معاشرے سے یہ بات تسلیم کروانے میں کامیاب ہو گیا کہ دوسرے معاشرتی عناصر کو خواہ فائدہ ہو یا نقصان مگر اُسے سرمایہ کے فراہم کرنے کے لیے ایک لگی بندھی رقم سُود کی صورت میں ہر حال میں ادا کر دی جائے گی۔ یہ اصول چونکہ مسیحیت کی تعلیمات کے بالکل منافی تھا اس لیے پہلے تو اس سُود کی مختلف توجیہات کی گئیں کہ یہ وہ اضافہ نہیں جسے مذہب نے حرام قرار دیا ہے بلکہ یہ دراصل نفع ہی کی ایک قسم ہے لیکن جب اس قسم کے دلائل لوگوں کو مطمئن نہ کر سکے تو یہ کہا جانے لگا کہ مذہب کو کاروبار سے کوئی تعلق نہ ہونا چاہیے۔ اس کا تعلق گویا کسی فرد کے مذہبی احساسات سے ہے۔

سیاسی زندگی میں بھی یہی الجھن پیش آئی۔ یورپی ریاستیں داخلی اور خارجی طور پر ایسا طرزِ عمل اور طریقِ کار اختیار کرنا چاہتی تھیں جن سے ان کے باشندے مادی لحاظ سے دوسروں پر تفوق اور برتری حاصل کریں اور دنیا کی کمزور قوموں کو زیادہ سے زیادہ لوٹا جا سکے۔ مگر مسیحی تعلیمات اس راہ میں قدم قدم پر مزاحم ہوتیں۔ چنانچہ پہلے مراحل میں تو انہیں تعبیر کے نام پر توڑ موڑ کر قوم کے مادی تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی کوششیں کی گئیں مگر جب اس میں خاطر خواہ کامیابی ہوتی نظر نہ آئی تو پھر کھلے طور پر اس بات کا اعلان کر دیا گیا کہ مذہب کو ریاست کے معاملات میں قطعاً دخیل نہ ہونا چاہیے اور مملکت کی تعمیر خالص سیکولر بنیادوں پر کرنا چاہیے۔

سیکولر ریاست کے معنی عام طور پر لوگ یہ لیتے ہیں کہ ریاست کا کوئی مذہب نہیں اور عوام جس مذہب کی چاہیں پیروی کریں۔ اس معاملے میں انہیں آزادی حاصل ہے۔ مگر یہ سیکولر ریاست کی نامکمل تعریف ہے۔ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ ریاست مذہب کے معاملے میں غیر جانبدار رہے۔ یہ بات صحیح نہیں۔ سیکولر ریاست مذہب کے معاملے میں اپنے خاص عزائم رکھتی ہے اور جو اصول اور مفادات بھی اس سے ٹکرائیں وہ انہیں ختم کرنے کے لیے اپنی پوری قوت صرف کرتی ہے۔ سیکولر ریاست کا مقصد وحید یہ ہوتا ہے کہ ملک کی پوری اجتماعی زندگی کی اس اصول پر تشکیل کی جائے کہ کسی قانون، ضابطے اور طرزِ عمل کے صحیح ہونے کا واحد معیار یہ ہے کہ وہ مادی نقطۂ نظر سے فائدہ مند ہو اور اس سے قوم اور ملک کو مادی منفعتیں حاصل ہوتی ہوں یا وہ مادی نقصانات سے اپنا دامن بچا سکتی ہو۔ یہ ایک مثبت طرزِ فکر ہے جس کے نتیجے میں مملکت ایک مخصوص طریقِ کار اختیار کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتی ہے۔ جس طرح وہ اپنے حفظ و بقا کے لیے عوام کو اس بات کی اجازت نہیں دے سکتی کہ وہ امنِ عامہ میں خلل ڈالیں یا توڑ پھوڑ کا سلسلہ جاری رکھیں، بالکل اسی طرح وہ کسی فرد یا گروہ کو ایسے اصول وضع کرنے یا ایسے ضابطوں کی پابندی کرنے کی اجازت بھی نہیں دے سکتی جو اُس کے مخصوص طریقِ کار میں حائل ہوں یا اُس کے مزاج سے مناسبت نہ رکھتے ہوں۔ ایسی ریاست کے اندر مذہب کے صرف وہ ضابطے اور اعمال گوارا کیے جا سکتے ہیں جو اجتماعی زندگی پر کسی طرح بھی اثر انداز نہ ہوتے ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ اہلِ یورپ کی پوری زندگی خالص الحاد کے سانچوں میں ڈھل کر رہ گئی ہے۔ مذہب اگر ہے تو وہ صرف گرجاؤں میں عبادت تک محدود ہے۔

یورپ میں جو مذہبی سرگرمیاں لوگوں کو نظر آتی ہیں اُن کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو ان کی نوعیت سمجھنے میں قطعاً دقت نہ ہوگی۔ ان کا مقصد زندگی کے اجتماعی معاملات کو نیکی اور خدا ترسی کی بنیاد پر استوار کرنا نہیں بلکہ مملکت اور ریاست کے عزائم کی تکمیل میں اس کی معاونت کرنا ہے۔ یورپ میں مذہب یا تو کسی فرد کے حاسہ مذہبی کی تسکین کا ایک نہایت بھونڈا ذریعہ بن کر رہ گیا ہے جس کا تعلق خارج کی کسی چیز سے نہیں بلکہ محض داخلی کیفیات اور قلبی واردات سے ہے یا یہ مملکت کے ہاتھ میں ایک ایسا آلہ کار ہے جس سے وہ لوگوں کو فریب دیتی اور بوقتِ ضرورت سادہ لوح عوام کو بہکا سکتی ہے۔ دورِ جدید میں ریاست کے

ہاتھوں مذہب کی جو مٹی پلید ہو رہی ہے اُسے اگر آپ جاننے کے خواہشمند ہوں تو رونلڈ ایڈورڈ ریتھ (RONALD EDWARD WREITH) کی کتاب "ترقی پذیر ممالک میں بگاڑ" CORRUPTION IN DEVELOPING COUNTRIES کے ایک باب "مذہب اور بگاڑ" کا مطالعہ کریں۔ اس سے انہیں معلوم ہو گا کہ ان مادیت پرست قوموں میں مذہب کا کیا حشر ہو رہا ہے اور اسے کن ناپاک عزائم کی تکمیل کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ مذہب جو درحقیقت انسانوں کی رہنمائی کے لیے آیا تھا اب نہایت گھٹیا مقاصد کی تکمیل کا ایک ذریعہ بن کر رہ گیا ہے۔ یہ مشنیری ادارے سب مغربی استعمار کے ایجنٹ ہیں جن سے وہ اپنے استحکام کا کام لیتا ہے۔ کیا مذہب اپنی اس کمزور اور ناکارہ حیثیت میں انسانوں کی رہنمائی کا کوئی فرض انجام دے سکتا ہے؟

مارکس چونکہ خود اپنی آنکھوں سے یہ دیکھ رہا تھا کہ مذہب کس طرح سرمایہ داروں، سیاست دانوں اور جاگیرداروں کے ہاتھ میں استحصال کا ایک ذریعہ بنا ہوا ہے اس لیے اس نے انسانی زندگی کی تعمیر نو کے لیے جو نیا نقشہ پیش کیا اس میں مذہب کی سرے سے کوئی گنجائش ہی نہیں چھوڑی۔ اس کا خیال یہ ہے کہ جب انسانی افکار و اعمال کا سرچشمہ مادیت ہے اور مادی فلاح و بہبود ہی انسان کی معراج ہے تو پھر اخلاق اور مذہب کی باتیں محض بیکار کی زنجیریں ہیں جنہیں توڑے بغیر انسان ترقی کے راستے پر گامزن نہیں ہو سکتا یہی وجہ ہے کہ جب روس میں اشتراکی انقلاب آیا تو سب سے پہلے مذہب کو ختم کیا گیا اور ہر اُس شخص کو چُن چُن کر ہلاک کیا گیا جو اس سے کوئی معمولی سا تعلق بھی رکھتا تھا۔ اس ملک میں اشتراکیت کے علمبرداروں نے اس اطمینان کے ساتھ اپنے سفر کا آغاز کیا کہ اب کوئی دینی ضابطہ یا مذہبی احساس مادیت کے اپنانے یا اُسے اپنی زندگی کا رہنما اصول بنانے میں ان کے راستے میں حائل نہ ہو گا۔

مذہب کا تو بلاشبہ خاتمہ کر دیا گیا مگر حاسۂ مذہبی جو انسان کی فطرت میں پیوست ہے اُس کا قلع قمع کرنا اُن کے لیے ممکن نہ تھا۔ چنانچہ دوسری جنگ عظیم کے موقع پر جب عوام کو خوشدلی کے ساتھ جنگ کی آگ میں جھونکنا مقصود تھا تو پھر عوامی احساسات کی رعایت رکھتے ہوئے چند مساجد اور گرجے واگزار کر دیئے گئے کہ لوگ

اپنے مذہبی احساس کی کسی حد تک تسکین کر سکیں اور بیرونِ ملک دنیا کی مذہب پسند قوموں کو دھوکا دے کر اس فیصلہ کن مرحلے پر اپنے ساتھ ملایا جاسکے۔ سرمایہ داری کی طرح یہاں بھی مذہب سے صرف یہی دو کام لیے گئے اور اس مذہب کو لوگوں کی سیاسی، معاشی اور معاشرتی زندگی پر قطعاً اثر انداز نہ ہونے دیا گیا۔

چین نے روس کے تجربے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پہلے مذہب سے براہِ راست تعارض کرنے سے گریز کیا۔ چونکہ اس کا میدانِ کار ایشیا ہے جہاں لوگ یورپ کی نسبت مذہب سے زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں اس لیے چین کے اشتراکیوں نے یہی بہتر سمجھا کہ مذہب کا براہِ راست گلا گھونٹنے کی بجائے ایسی فضا تیار کی جائے کہ مذہب خود بخود دم توڑ دے اور اشتراکیوں کے ہاتھ اس کے خون سے رنگنے نہ پائیں۔ چنانچہ چینی اشتراکیوں نے پہلے تو سرمایہ دارانہ نظام کی طرح اجتماعی دباؤ ڈال کر بالواسطہ طریقوں سے مذہب کا گلا گھونٹنے کی کوشش کی مگر جلد ہی انہوں نے اس حقیقت کو محسوس کر لیا کہ اہلِ چین کی اجتماعی زندگی کو خالص مادی بنیادوں پر اس وقت تک کامیابی کے ساتھ اٹھایا نہیں جاسکتا جب تک کہ ان ساری اقدار کو بالکل ملیامیٹ نہ کر دیا جائے جن کا سرچشمہ اخلاق اور روحانیت ہے۔ نیز انہیں اس امر کا بھی احساس ہوا کہ جس تیزی اور سرعت کے ساتھ وہ اپنی زندگی کو خالص مادیت کی بنیاد پر استوار کرنے کا عزم رکھتے ہیں اسی تیزی اور سرعت کے ساتھ مذہب ختم نہیں ہو رہا۔ خصوصاً مسلمانوں میں اس کے خاتمے کی رفتار بہت سست ہے۔ اسی وجہ سے چینی ثقافتی انقلاب کے داعیوں نے مسلمانوں کو دو ٹوک الفاظ میں متنبہ کر دیا ہے کہ انہیں اپنے ان سارے اصولوں اور ضابطوں کو پسِ پشت ڈال دینا اور ان ساری تعلیمات سے مُونہہ موڑ لینا چاہیے جو مادی محرکات کو انسانی افکار و اعمال کی بنیاد بنانے کے بجائے اخلاقی اور روحانی محرکات کو بنیاد بنانے کی تلقین کرتی ہیں۔ اب ان سے یہ چاہا جا رہا ہے کہ وہ اپنے دین اور ایمان کا اپنے ہاتھوں سے گلا گھونٹ کر پوری یکسوئی کے ساتھ اشتراکیت کی منزل کی طرف بڑھیں۔

اس طرح سے اس وقت مسلمان بحیثیتِ مجموعی مادیت کی دو گونہ یلغار کا سامنا کر رہے ہیں۔ جو مسلمان اشتراکیت کے زیرِ سایہ رہنے پر مجبور ہیں انہیں مذہب کو ترک کرنے کا براہ راست چیلنج دیا جا رہا ہے اور جو

سرمایہ دارانہ ممالک کے سیاسی، معاشی یا تہذیبی تسلط کے تحت زندگی بسر کر رہے ہیں اُن کے لیے ایسے ناسازگار حالات پیدا کیے جا رہے ہیں کہ مذہب کی پیروی اُن کے لیے کسی طرح ممکن نہ رہے اور وہ بھی مغرب کی تقلید میں اپنی زندگی خالص مادہ پرستانہ بنیادوں پہ استوار کریں اور مذہب کو رہنمائی کے مقام سے ہٹا کر اس پست مقام پہ لے آئیں جہاں اُسے مادی مقاصد اور عزائم کے حصول کے لیے بطور آلۂ کار استعمال کیا جا سکے۔ زندگی کے کسی اہم شعبے میں اس کا کوئی اثر باقی نہ رہے۔

سر سید سے لے کر آج تک کے متجددین کی تحریروں کا اگر مطالعہ کیا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے ہاں بھی تعبیر کے نام پہ اسلامی تعلیمات کے ساتھ ایک ایسا شرمناک کھیل کھیلا جا رہا ہے جو اصلاحِ مذہب کی آڑ میں اہلِ یورپ نے مسیحیت کے ساتھ کھیلا تھا۔ کسی مسئلہ کی تعبیر و توضیع کوئی ایسا غلط کام نہیں جس کی سرے سے کوئی گنجائش ہی نہ ہو۔ اگر یہ نیک نیتی اور ذہنی مرعوبیت کے بغیر دین کے پورے مزاج کو سامنے رکھتے ہوئے کی جائے تو یہ ایک دینی خدمت ہے لیکن اگر اس تعبیر کے پس پردہ یہ جذبہ کارفرما ہو کہ کسی طرح دینی تعلیمات کو توڑ مروڑ کر انہیں عہدِ حاضر کے غالب نظریات کے مطابق بنا دیا جائے تو یہ انتہائی بددیانتی اور مذہب کے ساتھ غداری ہے جس سے کسی مسلمان کو اللہ کی پناہ مانگنی چاہیے۔ اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو یہاں بھی مذہب کا وہی حشر ہو گا جو یورپ اور چین اور روس میں ہو رہا ہے۔

یہ ایک افسوسناک حقیقت ہے کہ اس وقت مسلمان ممالک میں جو لوگ اقتدار کے تخت پر مسلط ہیں وہ اپنے سامنے ملی فلاح و کامرانی کا وہی تصور رکھتے ہیں جو مادیت کی علمبردار قوموں کے ہاں پایا جاتا ہے۔ یہ حضرات بھی اپنے اپنے ملک میں اجتماعی زندگی کی تعمیر خالص مادی بنیادوں پہ کرنا چاہتے ہیں اور اس بنا پر مادی محرکات کو قوم کے فکر و عمل کی اساس بنانے کے متمنی ہیں مگر وہ جب یہ دیکھتے ہیں کہ قوم ایک ایسے نظامِ حیات سے وابستگی رکھتی ہے جس کے اصول اور ضابطے اس راہ میں حائل ہوتے ہیں تو پھر وہ مختلف طریقوں سے انہیں غیر مؤثر بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ ہمارے لیے حجت صرف قرآنِ مجید ہے اور جس صادق و مصدوق پر یہ

قرآن نازل ہوا اس کی تصریحات اپنے دَور کے لیے تو حجت تھیں مگر ہمارے لیے حجت نہیں۔ اس طرح سے قرآن مجید کی من مانی تاویلات کے لیے راستے کھولے جاتے ہیں۔ پھر ذرا ایک قدم اور بڑھایا جاتا ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ قرآن مجید کے چند اصول (اب اُن کی صراحت یہ کی جارہی ہے کہ توحید اور انسانی مساوات) تو ہر دَور کے لیے صحیح ہیں مگر کتاب الٰہی میں معاشرتی، سیاسی اور معاشی زندگی کے لیے جو ضابطے موجود ہیں اُن میں حالات کے تحت مناسب تغیرات کیے جا سکتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ آج سے چودہ سو برس پہلے کے قوانین کو دَورِ جدید میں نافذ کر دیا جائے۔ ہمارے دَور کے اپنے تقاضے ہیں جنہیں ہمیں خود اپنی عقل سے پُورا کرنا چاہیے۔ اور جس عقل کو رہنما بنایا جا رہا ہے یہ وہی عقل ہے جس کی بنیاد محسوسات، تجربات اور مشاہدات پر رکھی گئی ہے اور جس نے یورپ کو خالص الحاد کی راہ پر ڈال دیا تھا۔

ہمارے ہاں اسلامی تعلیمات کی جو نت نئی تاویلات ہوتی رہتی ہیں وہ اس بات کی شہادت فراہم کرتی ہیں کہ ہماری اجتماعی زندگی کی بنیادیں ہلائی جارہی ہیں اور اُس کی اخلاقی اور روحانی اساس کو مسمار کر کے اُسے مغرب کی تقلید میں خالص مادی بنیادوں پر تعمیر کیا جا رہا ہے۔ فتنۂ انکارِ حدیث، عائلی قوانین، خاندانی منصوبہ بندی، ثقافت کے نام پر ناچ گانے کا فروغ، مردوں اور عورتوں کی مخلوط مجالس، معاشی زندگی میں سُود کا غیر معمولی عمل دخل اور بے حجابی کا بڑھتا ہوا طوفان یہ سب وہ علامات ہیں جو ہماری ملی اساس کے اندر تبدیلی کی نہایت کھلے طور پر نشاندہی کر رہی ہیں۔ جب ان تاویلات کے خلاف آواز اٹھائی جاتی ہے تو بڑی معصومیت کے ساتھ یہ کہا جاتا ہے کہ دین کسی فرد یا گروہ کی اجارہ داری نہیں ہے۔ ہر شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اس میں غور کر کے اپنے نتائجِ فکر سے لوگوں کو روشناس کرے۔ ہمیں یہ بات تسلیم ہے کہ دین کسی فرد یا گروہ کی میراث نہیں۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ دین میں غور و خوض کر کے تفصیلات مرتب کرنے کا ہر اُس مسلمان کو اختیار ہے جو اس کی قابلیت اور استعداد رکھتا ہے۔ اس مقدس کام کو کسی خاص گروہ یا طبقے تک محدود نہیں کیا جا سکتا مگر اس بنیادی حقیقت کو بھی تو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ دین کی کسی تعلیم اور اس کے کسی اصول کی وہی تعبیر اور توضیح قبول کی جا سکتی ہے جو اس کے مزاج سے پُوری طرح مطابقت رکھتی ہو۔ آخر ایک

مسلمان اپنے ہوش و حواس قائم رکھتے ہوئے یہ بات کس طرح باور کر سکتا ہے کہ قرآن مجید کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی احکام ایک مخصوص دور کے لیے تو صحیح تھے مگر آج کل کے لیے ناقابلِ عمل ہیں، وہ اس بات کو آخر کس طرح ماننے پر تیار ہو سکتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات صرف آپ کی حیاتِ طیبہ میں برحق تھیں اور اب وہ ہمارے لیے حجت نہیں ہو سکتیں۔ اُس کا دماغ احکامِ الٰہی کی ایسی مضحکہ خیز تاویلات کس طرح قبول کر سکتا ہے کہ خنزیر کی چربی اور اس کے بال تو استعمال کیے جا سکتے ہیں کیونکہ قرآن مجید نے صرف اس کے گوشت کو حرام ٹھہرایا ہے یا مغرب میں مشینوں سے کٹے ہوئے جانوروں کا گوشت اس لیے جائز ہے کہ اسلام نے اہلِ کتاب کے ذبیحہ کے کھانے کی اجازت دی ہے۔ اس قسم کی تاویلات بلکہ تحریفات نہ تو کسی مسلمان کے ذہن کو اپیل کر سکتی ہیں اور نہ امت کا اجتماعی ضمیر انہیں گوارا کر سکتا ہے۔ ایک اَن پڑھ سے اَن پڑھ مسلمان بھی جو معمولی سی دینی حس بھی رکھتا ہے وہ بادنیٰ تامل یہ سمجھ سکتا ہے کہ اس قسم کی خرافات دین کے مزاج کے بالکل منافی ہیں اور ان سے دین کو تقویت پہنچنے کی بجائے اس کا حلیہ بگڑتا ہے۔

اس قسم کی فضول باتیں کرنے والوں نے شاید یہ سمجھ رکھا ہے کہ مسلم قوم ایک اخلاقی اور روحانی خلا کے اندر صدیوں سے زندہ چلی آرہی ہے۔ اُس کے قلب و دماغ پر مذہبی تعلیمات کا کوئی نقش سرے سے موجود نہیں۔ اُس کے ضمیر کے اندر مذہبی احساس کی کوئی رمق نہیں، اُسے عقل، قومی مفاد اور عصری تقاضوں کے نام پر جس چیز کی دعوت دی جائے گی وہ اس پر لبیک کہے گی۔ یہ ایک زبردست غلطی ہے جس میں مغربی قومیں اور اس ملت کا مغرب زدہ طبقہ بُری طرح گرفتار ہیں۔ مسلمانوں کا اسلام سے خواہ جذباتی تعلق ہی سہی مگر وہ اسے آج بھی اپنی فلاح و کامرانی کا واحد ذریعہ تسلیم کرتے ہیں۔ وہ اس کی تعلیمات سے پُوری طرح واقف نہ سہی مگر وہ اس کے مزاج سے تو ضرور آشنا ہیں۔ اُن کے ضمیر نیم مردہ ہی سہی مگر وہ زندگی کی اس قدر توانائی تو رکھتے ہیں کہ اس بات کا فیصلہ کر سکیں کہ کون سی تاویل و تعبیر اسلام کے اساسی تصورات سے متصادم ہے۔

جس قوم کے اندر مذہبی روایات رچی بسی ہوں اُس کی اساس کو اس قسم کی بھونڈی تاویلات سے بدلنا ناممکن ہے۔ مغرب میں اگر یہ تجربات کامیاب ہوئے تو اُس کی دوسری وجوہ ہیں مگر ہمارے ہاں گذشتہ دو سو سال سے یہ کوششیں ہو رہی ہیں اور ان کوششوں کے کرنے والوں میں بڑے بڑے سیاست دان،

اصحابِ اقتدار اور اہلِ علم شامل رہے ہیں مگر ان کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ اس کے علاوہ بر آمد نہیں ہوا کہ قوم ذہنی انتشار کا شکار ہوتی چلی گئی۔ ایک طرف اس کی حیاتِ اجتماعی کی مذہبی بنیادوں کو ان کم عقلوں نے متزلزل کر کے رکھ دیا اور دوسری طرف قوم مادی بنیادوں پہ اپنی حیاتِ اجتماعی تعمیر کرنے پر آمادہ نہ ہوئی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اُس کی ساری صلاحیتیں باہمی کشمکش اور سر پھٹول میں ضائع ہو رہی ہیں۔ خدا کرے کہ اس قوم کے سربراہ اس کے مزاج کو ٹھیک طور پر سمجھ کر اس کے فلاح و بقا کی کوئی صحیح راہ متعین کر سکیں۔ اور جو قومی صلاحیتیں خلل کشمکش میں ضائع ہو رہی ہیں وہی صلاحیتیں تعمیر و ترقی میں صرف ہوں۔

مغرب کی مادی ترقی جس نے مسلم قوم کے برسرِ اقتدار طبقوں کی آنکھوں کو ہی خیرہ نہیں کیا بلکہ ان سے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں کو بھی سلب کر لیا ہے، انسانیت کے لیے سراپا رحمت ہی نہیں، اس کے تاریک پہلو بھی اب لوگوں کے سامنے کھل کر آگئے ہیں۔ ان کی طرف سے آنکھیں بند کر کے ملت کو قوت و طاقت سے ان راہوں پر گھسیٹنے کے لیے تگ و دو کرنا جن کے خطرناک انجام ہم دیکھ رہے ہیں، کوئی دانشمندی اور حقیقت پسندی نہیں یہ بالکل ایک بے جا ضد ہے جس سے کبھی کوئی مفید نتیجہ بر آمد نہیں ہو سکتا۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ آپ دوسری اقوام کے فنی کمالات اور علمی انکشافات سے فائدہ نہ اٹھائیں۔ آپ ان سے پوری طرح استفادہ کریں۔ حکمت اور دانائی کی ہر بات مومن کی گم شدہ متاع ہے۔ اُسے قبول کرنے میں کبھی تامل نہ کرنا چاہیے۔ مگر یہ ذہن نشین رہے کہ ہر فرد اور ہر قوم کی ہر بات حکمت و دانائی کی بات نہیں ہو سکتی۔ بعض قومیں بھی افراد کی طرح بڑی نامعقول باتیں کرتی ہیں مگر اپنی حماقت سے انہیں حکمت اور دانائی کی باتیں سمجھ بیٹھتی ہیں۔ اس لیے انہیں اپنانے میں پورے حزم و احتیاط کا ثبوت دینا چاہیے۔ یہ عین ممکن ہے کہ ہم غیروں کی حکمت کو اپنانے اور اُس سے فائدہ اٹھانے میں مصروف رہیں اور یہ "حکمت" اندر ہی اندر ہماری ملی اساس کو کھوکھلا کرتی چلی جائے۔ حکمت اور دانائی وہی مفید ہے جو ہمارے نظامِ حیات سے پوری طرح مناسبت رکھتی ہو اور اس طرح اسے قوت و طاقت فراہم کرنے والی ہو۔ (باقی ص ۶۲ پر)

تفہیم القرآن

المجادلہ

نام | اس سورۃ کا نام المجادَلہ بھی ہے اور المجادِلہ بھی۔ یہ نام پہلی ہی آیت کے لفظ تُجَادِلُكَ سے ماخوذ ہے۔ چونکہ سورۃ کے آغاز میں اُن خاتون کا ذکر آیا ہے جنہوں نے اپنے شوہر کے ظہار کا قضیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کر کے بار بار اصرار کیا تھا کہ آپ کوئی ایسی صورت بتائیں جس سے ان کی اور ان کے بچوں کی زندگی تباہ ہونے سے بچ جائے، اور اللہ تعالیٰ نے ان کے اس اصرار کو لفظِ مجادلہ سے تعبیر فرمایا ہے، اس لیے یہی اس سورۃ کا نام قرار دیا گیا۔ اس کو اگر مجادَلہ پڑھا جائے تو اس کے معنی ہوں گے "بحث و تکرار"۔ اور مُجادِلہ پڑھا جائے تو معنی ہوں گے "بحث و تکرار کرنے والی"۔

زمانۂ نزول | کسی روایت میں اس امر کی تصریح نہیں کی گئی ہے کہ مجادلہ کا یہ واقعہ کب پیش آیا تھا۔ مگر ایک علامت اس سورہ کے مضمون میں ایسی ہے جس کی بنا پر یہ بات تعین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اس کا زمانہ غزوۂ احزاب (شوال ۵ھ) کے بعد کا ہے۔ سورۂ احزاب میں اللہ تعالیٰ نے منہ بولے بیٹے کے حقیقی بیٹا ہونے کی نفی کرتے ہوئے صرف یہ ارشاد فرما کر چھوڑ دیا تھا کہ وَمَا جَعَلَ اَزْوَاجَكُمُ الّٰئِیْ تُظٰهِرُوْنَ مِنْهُنَّ اُمَّهٰتِكُمْ (اور اللہ نے تمہاری اُن بیویوں کو جن سے تم ظہار کرتے ہو تمہاری مائیں نہیں بنا دیا ہے)۔ مگر اس میں یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ ظہار کرنا کوئی گناہ یا جرم ہے، اور نہ یہ بتایا گیا تھا کہ اس فعل کا شرعی حکم کیا ہے۔ بخلاف اس کے اس سورہ میں ظہار کا پورا قانون بیان کر دیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مفصل احکام اس مجمل ہدایت کے بعد نازل ہوئے ہیں۔

موضوع اور مباحث | اس سورۃ میں مسلمانوں کو اُن مختلف مسائل کے متعلق ہدایات دی گئی ہیں جو اُس وقت درپیش تھے۔

آغاز سورۃ سے آیت ۴ تک ظہار کے شرعی احکام بیان کیے گئے ہیں، اور اس کے ساتھ مسلمانوں کو پُوری سختی کے ساتھ متنبہ کیا گیا ہے کہ اسلام کے بعد بھی جاہلیت کے طریقوں پر قائم رہنا اور اللہ کی مقرر کی ہوئی حدوں کو توڑنا، یا ان کی پابندی سے انکار کرنا، یا ان کے مقابلہ میں خود اپنی مرضی سے کچھ اور قاعدے اور قوانین بنا لینا، قطعی طور پر ایمان کے منافی حرکت ہے، جس کی سزا دنیا میں بھی ذلت و رسوائی ہے اور آخرت میں بھی اس پر سخت باز پُرس ہونی ہے

آیات ۷ تا ۱۰ میں منافقین کی اس روش پر گرفت کی گئی ہے کہ وہ آپس میں خفیہ سرگوشیاں کر کے طرح طرح کی شرارتوں کے منصوبے بناتے تھے، اور ان کے دلوں میں جو بغض چھپا ہوا تھا اس کی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہودیوں کی طرح ایسے طریقے سے سلام کرتے تھے جس سے دُعا کے بجائے بد دعا کا پہلو نکلتا تھا۔ اس سلسلے میں مسلمانوں کو تسلی دی گئی ہے کہ منافقین کی یہ سرگوشیاں تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں، اس لیے تم اللہ کے بھروسے پر اپنا کام کرتے رہو۔ اور اس کے ساتھ ان کو یہ اخلاقی تعلیم بھی دی گئی ہے کہ سچے اہلِ ایمان کا کام گناہ اور ظلم و زیادتی اور رسول کی نافرمانی کے لیے سرگوشیاں کرنا نہیں ہے، وہ اگر آپس میں بیٹھ کر تخلیے میں کوئی بات کریں بھی تو وہ نیکی اور تقویٰ کی بات ہونی چاہیے۔

آیت ۱۱ تا ۱۳ میں مسلمانوں کو مجلسی تہذیب کے کچھ آداب سکھائے گئے ہیں اور بعض ایسے معاشرتی عیوب کو دُور کرنے کے لیے ہدایات دی گئی ہیں جو پہلے بھی لوگوں میں پائے جاتے تھے اور آج بھی پائے جاتے ہیں۔ کسی مجلس میں اگر بہت سے لوگ بیٹھے ہوتے ہوں اور باہر سے کچھ لوگ آجائیں تو پہلے سے بیٹھے ہوئے اصحاب اتنی سی زحمت گوارا نہیں کرتے کہ ذرا سمٹ کر بیٹھ جائیں اور دوسروں کے لیے گنجائش پیدا کر دیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بعد کے آنے والے کھڑے رہ جاتے ہیں، یا دہلیز میں بیٹھنے پر مجبور ہوتے ہیں، یا واپس چلے جاتے ہیں، یا یہ دیکھ کر کہ مجلس میں ابھی کافی گنجائش موجود

ہے، حاضرین کے اوپر سے پھاندتے ہوئے اندر گھستے ہیں۔ یہ صورتِ حال نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلسوں میں اکثر پیش آتی رہتی تھی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو یہ ہدایت فرمائی کہ اپنی مجلسوں میں خود غرضی اور تنگ دلی کا مظاہرہ نہ کیا کریں بلکہ بعد کے آنے والوں کو کھلے دل سے جگہ دے دیا کریں۔ اسی طرح ایک عیب لوگوں میں یہ بھی ہوتا ہے کہ کسی کے ہاں (خصوصاً کسی اہم شخصیت کے ہاں) جاتے ہیں تو جم کر بیٹھ جاتے ہیں اور اس بات کا کچھ خیال نہیں کرتے کہ ضرورت سے زیادہ اُس کا وقت لینا اُس کے لیے باعثِ زحمت ہوگا۔ اگر وہ کہے کہ حضرت اب تشریف لے جایئے تو بُرا مانتے ہیں۔ اُن کو چھوڑ کر اٹھ جائے تو بداخلاقی کی شکایت کرتے ہیں۔ اشارے کنایے سے اُن کو بتائے کہ اب کچھ دوسرے ضروری کاموں کے لیے اس کو وقت ملنا چاہیے تو سُنی اَن سُنی کر جاتے ہیں۔ لوگوں کے اس طرزِ عمل سے خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی سابقہ پیش آتا تھا اور آپ کی صحبت سے فائدہ اٹھانے کے شوق میں اللہ کے بندے اس بات کا لحاظ نہیں کرتے تھے کہ وہ بہت زیادہ قیمتی کاموں کا نقصان کر رہے ہیں۔ آخرکار اللہ تعالیٰ نے یہ تکلیف دہ عادت چھڑانے کے لیے حکم دیا کہ جب مجلس برخاست کرنے کے لیے کہا جائے تو اُٹھ جایا کرو۔ ایک اور عیب لوگوں میں یہ بھی تھا کہ ایک ایک آدمی آکر خواہ مخواہ حضورؐ سے تخلیہ میں بات کرنے کی خواہش کرتا تھا یا مجلسِ عام میں بھی پاس جا کر آپؐ کے قریب جا کر سرگوشی کے انداز میں آپ سے بات کرے۔ یہ چیز حضورؐ کے لیے بھی تکلیف دہ تھی اور دوسرے لوگ جو مجلس میں موجود ہوتے، ان کو بھی ناگوار ہوتی تھی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے یہ پابندی لگا دی کہ جو شخص بھی آپ سے علیحدگی میں بات کرنا چاہے وہ پہلے صدقہ دے۔ اس سے مقصود صرف یہ تھا کہ لوگوں کو اِس بری عادت پر متنبہ کیا جائے تاکہ وہ اسے چھوڑ دیں۔ چنانچہ یہ پابندی بس تھوڑی دیر تک باقی رکھی گئی اور جب لوگوں نے اپنا طرزِ عمل درست کر لیا تو اُسے منسوخ کر دیا گیا۔

آیت ۱۴ سے آخر سورہ تک مُسلم معاشرے کے لوگوں کو، جن میں مخلص اہلِ ایمان اور منافقین اور مذبذبین سب ملے جُلے تھے، بالکل دوٹوک طریقے سے بتایا گیا ہے کہ دین میں آدمی کے مخلص

ہونے کا معیار کیا ہے۔ ایک قسم کے مسلمان وہ ہیں جو اسلام کے دشمنوں سے دوستی رکھتے ہیں، اپنے مفاد کی خاطر اُس دین سے غداری کرنے میں کوئی تأمل نہیں کرتے جس پر ایمان رکھنے کا دعویٰ کرتے ہیں، اور اسلام کے خلاف طرح طرح کے شبہات اور وسوسے پھیلا کر اللہ کے بندوں کو اللہ کی راہ پر آنے سے روکتے ہیں، مگر چونکہ وہ مسلمانوں کے گروہ میں شامل ہیں، اس لیے ان کا جھوٹا اقرار ایمان اُن کے لیے ڈھال کا کام دیتا ہے۔ دوسری قسم کے مسلمان وہ ہیں جو اللہ کے دین کے معاملہ میں کسی اور کا لحاظ تو درکنار، خود اپنے باپ، بھائی، اولاد اور خاندان تک کی پروا نہیں کرتے۔ ان کا حال یہ ہے کہ جو خدا اور رسول اور اس کے دین کا دشمن ہے اس کے لیے ان کے دل میں کوئی محبت نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں صاف فرما دیا ہے کہ پہلی قسم کے لوگ چاہے کتنی ہی قسمیں کھا کھا کر اپنے مسلمان ہونے کا یقین دلائیں، درحقیقت وہ شیطان کی پارٹی کے لوگ ہیں۔ اور اللہ کی پارٹی میں شامل ہونے کا شرف صرف دوسری قسم کے مسلمانوں کو حاصل ہے۔ وہی سچے مومن ہیں۔ انہی سے اللہ راضی ہے۔ فلاح وہی پانے والے ہیں

اللہ کے نام سے جو رحمٰن اور رحیم ہے

اللہ نے سُن لی[۱] اُس عورت کی بات جو اپنے شوہر کے معاملہ میں تم سے تکرار کر رہی ہے اور اللہ سے فریاد کیے جاتی ہے۔ اللہ تم دونوں کی گفتگو سُن رہا ہے[۲]، وہ سب کچھ سننے اور دیکھنے والا ہے۔

---

[۱] یہاں سننے سے مراد محض سُن لینا نہیں ہے، بلکہ فریاد رسی کرنا ہے۔ جیسے ہم اُردو زبان میں کہتے ہیں اللہ نے دُعا سُن لی، اور اس سے مراد دعا قبول کر لینا ہوتا ہے۔

[۲] عام طور پر مترجمین نے اس مقام پر مجادلہ کر رہی تھی، فریاد کر رہی تھی، اور اللہ سن رہا تھا ترجمہ کیا ہے جس سے پڑھنے والے کا ذہن یہ مفہوم اخذ کرتا ہے کہ وہ خاتون اپنی شکایت سنا کر چلی گئی ہونگی اور بعد میں کسی وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی آئی ہو گی، اسی لیے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس عورت کی بات ہم نے سُن لی جو تم سے تکرار اور ہم سے فریاد کر رہی تھی، اور ہم اُس وقت تم دونوں کی بات سُن رہے تھے۔ لیکن اِس واقعہ کے

متعلق جو روایات احادیث میں آئی ہیں ان میں سے اکثر میں یہ بتایا گیا ہے کہ جس وقت وہ خاتون اپنے شوہر کے ظہار کا قصہ سنا سنا کر بار بار حضورؐ سے عرض کر رہی تھیں کہ اگر ہم دونوں کی جدائی ہو گئی تو میں مصیبت میں پڑ جاؤں گی اور میرے بچے تباہ ہو جائیں گے، عین اسی حالت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نزولِ وحی کی کیفیت طاری ہوئی اور یہ آیات نازل ہوئیں۔ اس بنا پر ہم نے اس کو ترجیح دی ہے کہ ترجمہ حال کے صیغوں میں کیا جائے۔

یہ خاتون جن کے معاملہ میں یہ آیات نازل ہوئی ہیں قبیلۂ خزرج کی خَولہ بنت ثعلبہ تھیں، اور ان کے شوہر اَوس بن صامت انصاری، قبیلۂ اوس کے سردار حضرت عُبادہ بن صامت کے بھائی تھے۔ ان کے ظہار کا قصہ آگے چل کر ہم تفصیل کے ساتھ نقل کریں گے۔ یہاں قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ ان صحابیہ کی فریاد کا بارگاہِ الٰہی میں مسموع ہونا اور فوراً ہی وہاں سے ان کی فریاد رسی کے لیے فرمان مبارک نازل ہونا ایک ایسا واقعہ تھا جس کی وجہ سے صحابۂ کرام میں ان کو ایک خاص قدر و منزلت حاصل ہو گئی تھی۔ ابن ابی حاتم اور بیہقی نے یہ روایت نقل کی ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ کچھ اصحاب کے ساتھ کہیں جا رہے تھے۔ راستہ میں ایک عورت ملی اور اس نے ان کو روکا۔ آپ فوراً رک گئے۔ سر جھکا کر دیر تک اس کی بات سنتے رہے اور جب تک اس نے بات ختم نہ کر لی آپ کھڑے رہے۔ ساتھیوں میں سے ایک صاحب نے عرض کیا امیر المومنین، آپ نے قریش کے سرداروں کو اس بڑھیا کے لیے اتنی دیر روکے رکھا۔ فرمایا جانتے بھی ہو یہ کون ہے؟ یہ خولہ بنت ثعلبہ ہے۔ یہ وہ عورت ہے جس کی شکایت سات آسمانوں پر سنی گئی۔ خدا کی قسم، اگر یہ رات تک مجھے کھڑا رکھتی تو میں کھڑا رہتا، بس نمازوں کے اوقات پر اس سے معذرت کر دیتا۔ ابن عبد البر نے استیعاب میں قتادہ کی روایت نقل کی ہے کہ یہ خاتون راستہ میں حضرت عمرؓ کو ملیں تو آپ نے ان کو سلام کیا۔ یہ سلام کا جواب دینے کے بعد کہنے لگیں "اوہو، اے عمر، ایک وقت تھا جب میں نے تم کو بازارِ عکاظ میں دیکھا تھا، اس وقت تم عُمیر کہلاتے تھے۔ لاٹھی ہاتھ میں لیے بکریاں چراتے پھرتے تھے۔ پھر کچھ زیادہ مدت نہ گزری تھی کہ تم عمرؓ کہلانے لگے۔ پھر ایک وقت آیا کہ تم امیر المومنین کہے جانے لگے۔ ذرا رعیت کے معاملہ میں اللہ سے ڈرتے رہو اور یاد رکھو کہ جو اللہ کی وعید سے ڈرتا ہے اس کے لیے دُور کا آدمی بھی قریبی رشتہ دار کی طرح ہوتا ہے، اور جو موت سے ڈرتا ہے اس کے حق میں اندیشہ ہے کہ وہ اسی چیز کو کھو دیگا جسے بچانا چاہتا ہے۔" اس پر جارُود عبدی جو حضرت عمرؓ کے ساتھ تھے، بولے، اے عورت، تو نے امیر المومنینؓ

تم میں سے جو لوگ اپنی بیویوں سے ظہار کرتے ہیں[۳] ان کی بیویاں ان کی مائیں نہیں ہیں، ان کی مائیں تو وہی ہیں جنہوں نے ان کو جنا ہے[۴]۔ یہ لوگ ایک سخت ناپسندیدہ اور جھوٹی بات کہتے ہیں[۵]، اور حقیقت یہ ہے

کے ساتھ بہت زبان درازی کی۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا، انہیں کہنے دو۔ جانتے بھی ہو یہ کون ہیں؟ ان کی بات تو سات آسمانوں کے اوپر سنی گئی تھی، عمر کو تو بدرجۂ اولیٰ سننی چاہیے۔ امام بخاریؒ نے بھی اپنی تاریخ میں اختصار کے ساتھ اس سے ملتا جلتا قصہ نقل کیا ہے۔

۳؎ عرب میں بسا اوقات یہ صورت پیش آتی تھی کہ شوہر اور بیوی میں لڑائی ہوتی تو شوہر غصے میں آ کر کہتا اَنْتِ عَلَیَّ کَظَھْرِ اُمِّی۔ اس کے لغوی معنی تو یہ ہیں کہ "تو میرے اوپر ایسی ہے جیسے میری ماں کی پیٹھ"، لیکن اس کا اصل مفہوم یہ ہے کہ "تجھ سے مباشرت کرنا میرے لیے ایسا ہے جیسے میں اپنی ماں سے مباشرت کروں"۔ اس زمانے میں بھی بہت سے نادان لوگ بیوی سے لڑ کر اس کو ماں، بہن، بیٹی سے تشبیہ دے بیٹھتے ہیں جس کا صاف مطلب یہ ہوتا ہے کہ آدمی گویا اب اسے بیوی نہیں بلکہ اُن عورتوں کی طرح سمجھتا ہے جو اس کے لیے حرام ہیں۔ اسی فعل کا نام ظہار ہے۔ ظَہر عربی زبان میں استعارے کے طور پر سواری کے لیے بولا جاتا ہے۔ مثلاً سواری کے جانور کو ظَہر کہتے ہیں، کیونکہ اس کی پیٹھ پر آدمی سوار ہوتا ہے۔ چونکہ وہ لوگ بیوی کو اپنے اوپر حرام کرنے کے لیے کہتے تھے کہ تجھے ظہر بنانا میرے اوپر ایسا حرام ہے جیسے اپنی ماں کو ظہر بنانا، اس لیے یہ کلمات زبان سے نکالنا اُن کی اصطلاح میں "ظہار" کہلاتا تھا۔ جاہلیت کے زمانہ میں اہلِ عرب کے ہاں یہ طلاق، بلکہ اس سے بھی زیادہ شدید قطعِ تعلق کا اعلان سمجھا جاتا تھا، کیونکہ ان کے نزدیک اس کے معنی یہ تھے کہ شوہر اپنی بیوی سے نہ صرف ازدواجی رشتہ توڑ رہا ہے بلکہ اسے ماں کی طرح اپنے اوپر حرام قرار دے رہا ہے۔ اسی بنا پر اہلِ عرب کے نزدیک طلاق کے بعد تو رجوع کی گنجائش ہو سکتی تھی مگر ظہار کے بعد رجوع کا کوئی امکان باقی نہ رہتا تھا۔

۴؎ یہ ظہار کے متعلق اللہ تعالیٰ کا پہلا فیصلہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر ایک شخص منہ پھوڑ کر بیوی کو ماں سے تشبیہ دے دیتا ہے تو اس کے ایسا کہنے سے بیوی ماں نہیں ہو سکتی، نہ اس کو وہ حرمت حاصل ہو سکتی ہے جو ماں کو حاصل ہے۔ ماں کا ماں ہونا تو ایک حقیقی امرِ واقعہ ہے، کیونکہ اس نے آدمی کو جنا ہے۔ اسی بنا پر اُسے ابدی حرمت حاصل ہے۔ اب آخر وہ عورت جس نے اس کو نہیں جنا ہے، محض منہ سے کہہ دینے پر

کہ اللہ بڑا معاف کرنے والا اور درگزر فرمانے والا ہے۔[۶]

اس کی ماں کیسے ہو جائے گی، اور اس کے بارے میں عقل، اخلاق، قانون، کسی چیز کے اعتبار سے بھی وہ حُرمت کیسے ثابت ہو گی جو اس امرِ واقعی کی بنا پر جننے والی ماں کے لیے ہے۔ اس طرح یہ بات ارشاد فرما کر اللہ تعالیٰ نے جاہلیت کے اُس قانون کو منسوخ کر دیا جس کی رُو سے ظہار کرنے والے شوہر سے اس کی بیوی کا نکاح ٹوٹ جاتا تھا اور وہ اس کے لیے ماں کی طرح قطعی حرام سمجھ لی جاتی تھی۔

۵ یعنی بیوی کو ماں سے تشبیہ دینا اوّل تو ایک نہایت ہی بیہودہ اور شرمناک بات ہے جس کا تصور بھی کسی شریف آدمی کو نہ کرنا چاہیے، کجا کہ وہ اسے زبان سے نکالے۔ دوسرے یہ جھوٹ بھی ہے۔ کیونکہ ایسی بات کہنے والا اگر یہ خبر دے رہا ہے کہ اس کی بیوی اس کے لیے اب ماں ہو گئی ہے تو جھوٹی خبر دے رہا ہے۔ اور اگر وہ اپنا یہ فیصلہ سنا رہا ہے کہ آج سے اس نے اپنی بیوی کو ماں کی سی حُرمت بخش دی ہے تو بھی اس کا یہ دعویٰ جھوٹا ہے، کیونکہ خدا نے اسے یہ اختیارات نہیں بخش دیئے ہیں کہ جب تک چاہے ایک عورت کو بیوی کے حکم میں رکھے، اور جب چاہے اسے ماں کے حکم میں کر دے۔ شارع وہ نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ ہے، اور اللہ تعالیٰ نے جننے والی ماں کے ساتھ مادری کے حکم میں دادی، نانی، ساس، دودھ پلانے والی عورت اور ازواج نبیؐ کو شامل کیا ہے۔ کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ اِس حکم میں اپنی طرف سے کسی اور عورت کو داخل کر دے، کجا کہ اُس عورت کو جو اس کی بیوی رہ چکی ہے ـــــ اِس ارشاد سے یہ دوسرا قانونی حکم نکلا کہ ظہار کرنا ایک بڑا گناہ اور حرام فعل ہے جس کا مرتکب سزا کا مستحق ہے۔

۶ یعنی یہ حرکت تو ایسی ہے کہ اس پر آدمی کو بہت ہی سخت سزا ملنی چاہیے، لیکن یہ اللہ تعالیٰ کی مہربانی ہے کہ اُس نے اوّل تو ظہار کے معاملہ میں جاہلیت کے قانون کو منسوخ کر کے تمہاری خانگی زندگی کو تباہی سے بچا لیا، دوسرے اس فعل کا ارتکاب کرنے والوں کے لیے وہ سزا تجویز کی جو اِس جُرم کی ہلکی سے ہلکی سزا ہو سکتی تھی، اور سب سے بڑی مہربانی یہ ہے کہ سزا کسی ضرب یا قید کی شکل میں نہیں بلکہ چند ایسی عبادات اور نیکیوں کی شکل میں تجویز کی جو تمہارے نفس کی اصلاح کرنے والی اور تمہارے معاشرے میں بھلائی پھیلانے والی ہیں۔ اِس سلسلے میں یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیے کہ اسلام میں بعض جرائم اور گناہوں پر جو عبادات بطورِ کفارہ مقرر کی گئی ہیں وہ نہ محض سزا ہیں کہ عبادت

جو لوگ اپنی بیویوں سے ظہار کریں پھر اپنی اُس بات سے رجوع کریں جو انہوں نے کہی تھی، تو قبل اس کے

کی روح سے خالی ہوں اور نہ محض عبادت ہیں کہ سزا کی اذیت کا کوئی پہلو اُن میں نہ ہو، بلکہ ان میں یہ دونوں پہلو جمع کر دیئے گئے ہیں، تاکہ آدمی کو اذیت بھی ہو اور ساتھ ساتھ وہ ایک نیکی اور عبادت کر کے اپنے گناہ کی تلافی بھی کر دے۔

ﷺ یہاں سے ظہار کے قانونی حکم کا بیان شروع ہو رہا ہے۔ اس کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ظہار کے وہ واقعات نگاہ میں رہیں جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں پیش آئے تھے، کیونکہ اسلام میں ظہار کا مفصّل قانون انہی آیات اور اُن فیصلوں سے ماخوذ ہے جو اِن آیات کے نزول کے بعد حضورؐ نے پیش آمدہ واقعات میں صادر فرمائے۔

حضرت عبداللہ بن عباس کے بیان کے مطابق اسلام میں ظہار کا پہلا واقعہ اَوس بن صامت انصاری کا ہے جن کی بیوی خَولہ کی فریاد پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں۔ محدثین نے اس واقعہ کی جو تفصیلات متعدد راویوں سے نقل کی ہیں اُن میں فروعی اختلافات تو بہت سے ہیں، مگر قانونی اہمیت رکھنے والے ضروری اجزاء قریب قریب متفق علیہ ہیں۔ خلاصہ ان روایات کا یہ ہے کہ حضرت اَوس بن صامت بڑھاپے میں کچھ چڑچڑے بھی ہو گئے تھے اور بعض روایات کی رُو سے ان کے اندر کچھ جنون کی سی لٹک بھی پیدا ہو گئی تھی جس کے لیے راویوں نے کَانَ بِہٖ لَمَمٌ کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ لَمَم عربی زبان میں دیوانگی کو نہیں کہتے بلکہ اُس طرح کی ایک کیفیت کو کہتے ہیں جسے ہم اردو زبان میں "غصے میں پاگل ہو جانے" کے الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس حالت میں وہ پہلے بھی متعدد مرتبہ اپنی بیوی سے ظہار کر چکے تھے، مگر اسلام میں یہ پہلا موقع تھا کہ بیوی سے لڑ کر ان سے پھر اس حرکت کا صدور ہو گیا۔ اس پر ان کی اہلیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور سارا قصہ آپ سے بیان کر کے عرض کیا کہ یا رسول اللہ، کیا میری اور میرے بچوں کی زندگی کو تباہی سے بچانے کے لیے رخصت کا کوئی پہلو نکل سکتا ہے؟ حضورؐ نے جو جواب دیا وہ مختلف راویوں نے مختلف الفاظ میں نقل کیا ہے۔ بعض روایات میں الفاظ یہ ہیں کہ "ابھی تک اِس مسئلے میں مجھے کوئی حکم نہیں دیا گیا ہے"۔ اور بعض میں یہ الفاظ ہیں کہ "میرا خیال یہ ہے کہ تم اُس پر حرام ہو گئی ہو"۔ اور بعض میں یہ ہے کہ آپ نے فرمایا "تم اس پر حرام ہو گئی ہو"۔ اس جواب کو سن کر وہ نالہ و فریاد کرنے لگیں۔ بار بار انہوں نے حضورؐ سے عرض کیا کہ انہوں نے طلاق کے الفاظ تو نہیں کہے ہیں، آپ

کوئی صورت ایسی بتائیں جس سے میں اور میرے بچے اور میرے بوڑھے شوہر کی زندگی تباہ ہونے سے بچ جائے۔ مگر ہر مرتبہ حضورؐ ان کو وہی جواب دیتے رہے۔ اتنے میں آپ پر نزولِ وحی کی کیفیت طاری ہوئی اور یہ آیات نازل ہوئیں۔ اس کے بعد آپ نے ان سے کہا (اور بعض روایات کی رُو سے ان کے شوہر کو بلا کر ان سے فرمایا)، کہ ایک غلام آزاد کرنا ہوگا۔ انہوں نے اس سے معذوری ظاہر کی، تو فرمایا دو مہینے کے لگاتار روزے رکھنے ہونگے۔ انہوں نے عرض کیا کہ اُس کا حال تو یہ ہے کہ دن میں تین مرتبہ کھائیں پئیں نہیں تو ان کی بینائی جواب دینے لگتی ہے۔ آپ نے فرمایا پھر ۶۰ مسکینوں کو کھانا دینا پڑے گا۔ انہوں نے عرض کیا وہ اتنی مقدرت نہیں رکھتے، اِلّا یہ کہ آپ مدد فرمائیں۔ تب آپ نے انہیں اتنی مقدار میں سامان خوراک عطا فرمایا جو ۶۰ آدمیوں کی دو وقت کی غذا کے لیے کافی ہو۔ اس کی مقدار مختلف روایات میں مختلف بیان کی گئی ہے، اور بعض روایات میں یہ ہے کہ جتنی مقدار حضورؐ نے عطا فرمائی اتنی ہی خود حضرت خَولہؓ نے اپنے شوہر کو دی تاکہ وہ کفارہ ادا کرسکیں۔ (ابن جریر، مسند احمد، ابوداؤد، ابن ابی حاتم)

ظہار کا دوسرا واقعہ سَلَمہ بن صَخر بیاضی کا ہے۔ اِن صاحب پر اعتدال سے کچھ زیادہ شہوت کا غلبہ تھا۔ رمضان آیا تو انہوں نے اس اندیشہ سے کہ کہیں روزے کی حالت میں دن کے وقت بے صبری نہ کر بیٹھیں رمضان کے اختتام تک کے لیے بیوی سے ظہار کر لیا۔ مگر اپنی اس بات پر قائم نہ رہ سکے اور ایک رات بیوی کے پاس چلے گئے۔ پھر نادم ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ماجرا عرض کیا۔ آپ نے فرمایا ایک غلام آزاد کرو۔ انہوں نے کہا میرے پاس تو اپنی بیوی کے سوا کوئی نہیں جسے آزاد کر دوں۔ فرمایا دو مہینے کے مسلسل روزے رکھو۔ انہوں نے عرض کیا کہ روزے ہی میں تو صبر نہ کرسکنے کی وجہ سے اِس مصیبت میں پھنسا ہوں۔ حضورؐ نے فرمایا پھر ۶۰ مسکینوں کو کھانا کھلاؤ۔ انہوں نے کہا ہم تو اس قدر غریب ہیں کہ رات بے کھائے سوئے ہیں۔ اس پر آپ نے بنی زُرَیق کے محصّلِ زکوٰۃ سے ان کو اتنا سامانِ خوراک دلوایا کہ ۶۰ آدمیوں میں بانٹ دیں اور کچھ اپنے بال بچوں کی ضروریات کے لیے بھی رکھ لیں۔ (مسند احمد۔ ابوداؤد۔ ترمذی)

تیسرا واقعہ نام کی تصریح کے بغیر یہ بیان کیا گیا ہے کہ ایک شخص نے اپنی بیوی سے ظہار کیا اور پھر کفارہ ادا کرنے سے پہلے ہی اس سے مباشرت کرلی۔ بعد میں حضورؐ سے مسئلہ پوچھا تو آپ نے حکم دیا کہ اس سے الگ رہو جب تک کفارہ ادا نہ کردو۔ (ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ)

چوتھا واقعہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو سنا کہ اپنی بیوی کو بہن کہہ کر پکار رہا ہے۔ اس پر آپ نے غصے سے فرمایا "یہ تیری بہن ہے؟" مگر آپ نے اسے ظہار قرار نہیں دیا۔ (ابوداؤد)

یہ چار معتبر واقعات ہیں جو مستند ذرائع سے احادیث میں ملتے ہیں اور انہی کی مدد سے قرآن مجید کے اس حکم کو اچھی طرح سمجھا جاسکتا ہے جو آگے کی آیتوں میں بیان ہوا ہے۔

ش۵ اصل الفاظ ہیں یَعُوۡدُوۡنَ لِمَا قَالُوۡا۔ لفظی ترجمہ یہ ہوگا کہ "پلٹیں اس بات کی طرف جو انہوں نے کہی" لیکن عربی زبان اور محاورے کے لحاظ سے ان الفاظ کے معنی میں بڑا اختلاف واقع ہوگیا ہے:

ایک مفہوم ان کا یہ ہوسکتا ہے کہ ایک دفعہ ظہار کے الفاظ منہ سے نکل جانے کے بعد پھر ان کا اعادہ کریں۔ ظاہریہ اور بُکیر بن الاشج، اور یحییٰ بن زیاد الفرّاء اسی کے قائل ہیں، اور عطاء بن ابی رباح سے بھی ایک قول اسی کی تائید میں منقول ہوا ہے۔ ان کے نزدیک ایک دفعہ کا ظہار تو معاف ہے، البتہ آدمی اس کی تکرار کرے تب اس پر کفارہ لازم آتا ہے۔ لیکن یہ تفسیر دو وجوہ سے صریحاً غلط ہے۔ ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ظہار کو بیہودہ اور جھوٹی بات قرار دے کر اس کے لیے سزا تجویز فرمائی ہے۔ اب کیا یہ بات قابل تصور ہے کہ ایک مرتبہ جھوٹی اور بیہودہ بات آدمی کہے تو معاف ہو اور دوسری مرتبہ کہے تو سزا کا مستحق ہوجائے؟ دوسری وجہ اس کے غلط ہونے کی یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہار کرنے والے کسی شخص سے بھی یہ سوال نہیں کیا کہ آیا اس نے ایک بار ظہار کیا ہے یا دو بار۔

دوسرا مفہوم اس کا یہ ہے کہ جو لوگ زمانہ جاہلیت میں یہ حرکت کرنے کے عادی تھے وہ اگر اسلام میں اس کا اعادہ کریں تو اس کی یہ سزا ہے۔ اس کے معنی یہ ہونگے کہ ظہار کرنا بجائے خود مستوجب سزا ہو اور جو شخص بھی اپنی بیوی کے لیے ظہار کے الفاظ منہ سے نکالے اس پر کفارہ لازم آجائے، خواہ وہ اس کے بعد بیوی کو طلاق دے دے، یا اس کی بیوی مرجائے، یا اس کا کوئی ارادہ اپنی بیوی سے تعلق زن وشوہر رکھنے کا نہ ہو۔ فقہاء میں سے طاؤس، مجاہد شعبی، زہری، سفیان ثوری اور قتادہ کا یہی مسلک ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ظہار کے بعد اگر عورت مرجائے تو شوہر اس وقت تک اس کی میراث نہیں پاسکتا جب تک کفارہ ادا نہ کردے۔

تیسرا مفہوم یہ ہے کہ ظہار کے الفاظ زبان سے نکال لینے کے بعد آدمی پلٹ کر اس بات کا تدارک کرنا چاہے جو اس نے کہی ہے۔ بالفاظ دیگر عاد لما قال کے معنی ہیں کہنے والے نے اپنی بات سے رجوع کرلیا۔

کہ دونوں ایک دوسرے کو ہاتھ لگائیں، ایک غلام آزاد کرنا ہوگا۔ اِس سے تم کو نصیحت کی جاتی ہے[۹] اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے[۱۰]۔ اور جو شخص غلام نہ پائے وہ دو مہینے کے پے درپے روزے رکھے قبل اس کے کہ دونوں ایک دوسرے کو ہاتھ لگائیں۔ اور جو اس پر بھی قادر نہ ہو وہ ۶۰ مسکینوں کو کھانا کھلائے[۱۱]۔

چوتھا مفہوم یہ ہے کہ جس چیز کو آدمی نے ظہار کر کے اپنے لیے حرام کیا تھا اسے پلٹ کر پھر اپنے لیے حلال کرنا چاہے۔ بالفاظِ دیگر عاد لما قال کے معنی یہ ہیں کہ جو شخص تحریم کا قائل ہو گیا تھا وہ اب تحلیل کی طرف پلٹ آیا۔

اکثر و بیشتر فقہاء نے انہی دو مفہوموں میں سے کسی ایک کو ترجیح دی ہے۔

۹؎ بالفاظِ دیگر یہ حکم تمہاری تادیب کے لیے دیا جا رہا ہے تاکہ مسلم معاشرے کے لوگ جاہلیت کی اس بُری عادت کو چھوڑ دیں اور تم میں سے کوئی شخص اس بیہودہ حرکت کا ارتکاب نہ کرے۔ بیوی سے لڑنا ہے تو بھلے آدمیوں کی طرح لڑو، طلاق ہی دینا ہو تو سیدھی طرح طلاق دے دو۔ یہ آخر کیا شرافت ہے کہ آدمی جب بیوی سے لڑے تو اسے ماں بہن بنا کر ہی چھوڑے۔

۱۰؎ یعنی اگر آدمی گھر میں چپکے سے بیوی کے ساتھ ظہار کر بیٹھے اور پھر کفارہ ادا کیے بغیر میاں اور بیوی کے درمیان حسبِ سابق زوجیت کے تعلقات چلتے رہیں، تو چاہے دنیا میں کسی کو بھی اس کی خبر نہ ہو، اللہ کو تو بہرحال اس کی خبر ہوگی۔ اللہ کے مواخذہ سے بچ نکلنا ان کے لیے کسی طرح ممکن نہیں ہے۔

۱۱؎ یہ ہے ظہار کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا حکم۔ فقہائے اسلام نے اس آیت کے الفاظ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلوں، اور اسلام کے اصولِ عامہ سے اس سلسلے میں جو قانون اخذ کیا ہے اس کی تفصیلات یہ ہیں:

اسلام کا یہ قانون عربِ جاہلیت کے اُس رواج کو منسوخ کرتا ہے جس کی رو سے یہ فعل نکاح کے رشتے کو توڑ دیتا تھا اور عورت شوہر کے لیے ابداً حرام ہو جاتی تھی۔ اسی طرح یہ قانون ان تمام قوانین اور رواجوں کو بھی منسوخ کرتا ہے جو ظہار کو بے معنی اور بے اثر سمجھتے ہوں اور آدمی کے لیے اس بات کو جائز رکھتے ہوں کہ وہ اپنی بیوی کو ماں یا محرمات سے تشبیہ دے کر بھی اس کے ساتھ حسبِ سابق زن و شو کا تعلق جاری رکھے، کیونکہ اسلام کی نگاہ میں ماں اور دوسری محرمات کی حرمت ایسی معمولی چیز نہیں ہے کہ انسان ان کے اور بیوی کے درمیان مشابہت کا خیال بھی کرے، کجا کہ اس کو زبان پر لائے۔ اِن دونوں انتہاؤں کے درمیان اسلامی قانون نے اس معاملہ میں جو موقف اختیار کیا ہے وہ تین بنیادوں پر قائم ہے۔ ایک یہ کہ ظہار سے نکاح نہیں ٹوٹتا بلکہ عورت بدستور شوہر کی بیوی رہتی ہے۔ دوسرے یہ کہ ظہار سے عورت وقتی طور پر شوہر کے

لیے حرام ہو جاتی ہے۔ تیسرے یہ کہ یہ حرمت اس وقت تک باقی رہتی ہے جب تک شوہر کفارہ ادا نہ کر دے، اور یہ کہ صرف کفارہ ہی اس حرمت کو رفع کر سکتا ہے۔

۲۔ ظہار کرنے والے شخص کے بارے میں یہ امر متفق علیہ ہے کہ اُس شوہر کا ظہار معتبر ہے جو عاقل و بالغ ہو اور بحالتِ ہوش و حواس ظہار کے الفاظ زبان سے ادا کرے۔ بچے اور مجنون کا ظہار معتبر نہیں ہے۔ نیز ایسے شخص کا ظہار بھی معتبر نہیں جو ان الفاظ کو ادا کرتے وقت اپنے ہوش و حواس میں نہ ہو، مثلاً سوتے میں بڑبڑائے، یا کسی نوعیت کی بیہوشی میں مبتلا ہو گیا ہو۔ اس کے بعد حسبِ ذیل امُور میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے:

الف۔ نشے کی حالت میں ظہار کرنے والے کے متعلق ائمۂ اربعہ سمیت فقہاء کی عظیم اکثریت یہ کہتی ہے کہ اگر کسی شخص نے کوئی نشہ آور چیز جان بوجھ کر استعمال کی ہو تو اس کا ظہار اس کے طلاق کی طرح قانوناً صحیح مانا جائے گا، کیونکہ اس نے یہ حالت اپنے اوپر خود طاری کی ہے۔ البتہ اگر مرض کی وجہ سے اس نے کوئی دوا پی ہو اور اس سے نشہ لاحق ہو گیا ہو، یا پیاس کی شدت میں وہ جان بچانے کے لیے شراب پینے پر مجبور ہُوا ہو تو اس طرح کے نشے کی حالت میں اس کے ظہار و طلاق کو نافذ نہیں کیا جائے گا۔ احناف اور شوافع اور حنابلہ کی رائے یہی ہے اور صحابہ کا عام مسلک بھی یہی تھا۔ بخلاف اس کے حضرت عثمانؓ کا قول یہ ہے کہ نشے کی حالت میں طلاق و ظہار معتبر نہیں ہے۔ احناف میں سے امام طحاویؒ اور کرخیؒ اس قول کو ترجیح دیتے ہیں اور امام شافعیؒ کا بھی ایک قول اس کی تائید میں ہے۔ مالکیہ کے نزدیک ایسے نشے کی حالت میں ظہار معتبر ہو گا جس میں آدمی بالکل بہک نہ گیا ہو، بلکہ وہ مربوط اور مرتب کلام کر رہا ہو اور اسے یہ احساس ہو کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔

ب۔ امام ابو حنیفہؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک ظہار صرف اُس شوہر کا معتبر ہے جو مسلمان ہو۔ ذمیوں پر ان احکام کا اطلاق نہیں ہوتا، کیونکہ قرآن مجید میں اَلَّذِيْنَ يُظٰهِرُوْنَ مِنْكُمْ کے الفاظ ارشاد ہوئے ہیں جن کا خطاب مسلمانوں سے ہے، اور تین قسم کے کفاروں میں سے ایک کفارہ قرآن میں روزہ بھی تجویز کیا گیا ہے جو ظاہر ہے کہ ذمیوں کے لیے نہیں ہو سکتا۔ امام شافعی اور امام احمد کے نزدیک یہ احکام ذمی اور مسلمان، دونوں کے ظہار پر نافذ ہوں گے، البتہ ذمی کے لیے روزہ نہیں ہے۔ وہ یا غلام آزاد کرے یا ۶۰ مسکینوں کو کھانا کھلائے۔

ج۔ کیا مرد کی طرح عورت بھی ظہار کر سکتی ہے؟ مثلاً اگر وہ شوہر سے کہے کہ تو میرے لیے میرے باپ کی طرح

ہے، یا میں تیرے لیے تیری ماں کی طرح ہوں، تو کیا یہ بھی ظہار ہو گا؟ ائمہ اربعہ کہتے ہیں کہ یہ ظہار نہیں ہے اور اس پر ظہار کے قانونی احکام کا سرے سے اطلاق نہیں ہوتا۔ کیونکہ قرآن مجید نے صریح الفاظ میں یہ احکام صرف اُس صورت کے لیے بیان کیے ہیں جبکہ شوہر بیویوں سے ظہار کریں (وَالَّذِينَ يُظَاهِرُونَ مِن نِّسَآئِهِمْ)۔ اور ظہار کرنے کے اختیارات اُسی کو حاصل ہو سکتے ہیں جسے طلاق دینے کا اختیار ہے۔ عورت کو شریعت نے جس طرح یہ اختیار نہیں دیا کہ شوہر کو طلاق دیدے اُسی طرح اُسے یہ اختیار بھی نہیں دیا کہ اپنے آپ کو شوہر کے لیے حرام کرلے۔ یہی رائے سفیان ثوری، اسحٰق بن راہَوَیہ، ابو ثور اور لیث بن سعد کی ہے کہ عورت کا ایسا قول بالکل بے معنی اور بے اثر ہے۔ امام ابو یوسف کہتے ہیں کہ یہ ظہار تو نہیں ہے، مگر اس سے عورت پر قسم کا کفارہ لازم آئے گا، کیونکہ عورت کا ایسے الفاظ کہنا یہ معنی رکھتا ہے کہ اس نے اپنے شوہر سے تعلق نہ رکھنے کی قسم کھائی ہے۔ امام احمد بن حنبل کا مسلک بھی ابن قُدامہ نے یہی نقل کیا ہے۔ امام اَوزاعی کہتے ہیں کہ اگر شادی سے پہلے عورت نے یہ بات کہی ہو کہ میں اُس شخص سے شادی کروں تو وہ میرے لیے ایسا ہے جیسے میرا باپ، تو یہ ظہار ہو گا، اور اگر شادی کے بعد کہے تو یہ قسم کے معنی میں ہو گا جس سے کفارۂ یمین لازم آئے گا۔ بخلاف اس کے حسن بصری، زُہری، ابراہیم نخعی، اور حسن بن زیاد لُؤلؤی کہتے ہیں کہ یہ ظہار ہے اور ایسا کہنے سے عورت پر کفارۂ ظہار لازم آئے گا، البتہ عورت کو یہ حق نہ ہو گا کہ کفارہ دینے سے پہلے شوہر کو اپنے پاس آنے سے روک دے۔ ابراہیم نخعی اس کی تائید میں یہ واقعہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت طلحہؓ کی صاحبزادی عائشہ سے حضرت زبیر کے صاحبزادے مُصعب نے نکاح کا پیغام دیا۔ انہوں نے اسے رد کرتے ہوئے یہ الفاظ کہہ دیئے کہ اگر میں اُن سے نکاح کروں تو هُوَ عَلَيَّ كَظَهْرِ أَبِي (وہ میرے اوپر ایسے ہوں جیسے میرے باپ کی پیٹھ)۔ کچھ مدت بعد وہ ان سے شادی کرنے پر راضی ہو گئیں۔ مدینہ کے علماء سے اس کے متعلق فتویٰ لیا گیا تو بہت سے فقہاء نے جن میں متعدد صحابہ بھی شامل تھے، یہ فتویٰ دیا کہ عائشہ پر کفارۂ ظہار لازم ہے۔ اس واقعہ کو نقل کرنے کے بعد ابراہیم نخعی اپنی یہ رائے بیان کرتے ہیں کہ اگر عائشہ یہ بات شادی کے بعد کہتیں تو کفارہ لازم نہ آتا، مگر انہوں نے شادی سے پہلے یہ کہا تھا جب انہیں نکاح کرنے یا نہ کرنے کا اختیار حاصل تھا اس لیے کفارہ ان پر واجب ہو گیا۔

۳۔ جو عاقل و بالغ آدمی ظہار کے صریح الفاظ بحالتِ ہوش و حواس زبان سے ادا کرے اس کا یہ عذر

قابلِ قبول نہیں ہو سکتا کہ اس نے غصے میں، یا مذاق مذاق میں، یا پیار سے ایسا کہا، یا یہ کہ اس کی نیت ظہار کی نہ تھی۔ البتہ جو الفاظ اس معاملہ میں صریح نہیں ہیں، اور جن میں مختلف معنوں کا احتمال ہے، ان کا حکم الفاظ کی نوعیت پر منحصر ہے۔ (آگے چل کر ہم بتائیں گے کہ ظہار کے صریح الفاظ کون سے ہیں اور غیر صریح کون سے)

۴- یہ امر متفق علیہ ہے کہ ظہار اُس عورت سے کیا جا سکتا ہے جو آدمی کے نکاح میں ہو۔ البتہ اس امر میں اختلاف ہے کہ کیا غیر عورت سے بھی ظہار ہو سکتا ہے۔ اس معاملہ میں مختلف مسالک یہ ہیں:

حنفیہ کہتے ہیں کہ غیر عورت سے اگر آدمی یہ کہے کہ "میں تجھ سے نکاح کروں تو میرے اوپر تُو ایسی ہے جیسے میری ماں کی پیٹھ"، تو جب بھی وہ اس سے نکاح کریگا کفارہ ادا کیے بغیر اسے ہاتھ نہ لگا سکے گا۔ یہی حضرت عمرؓ کا فتویٰ ہے۔ اُن کے زمانہ میں ایک شخص نے ایک عورت سے یہ بات کہی اور بعد میں اس سے نکاح کر لیا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا اُسے کفارۂ ظہار دینا ہوگا۔

مالکیہ اور حنابلہ بھی یہی بات کہتے ہیں، اور وہ اس پر یہ اضافہ کرتے ہیں کہ اگر عورت کی تخصیص نہ کی گئی ہو بلکہ کہنے والے یوں کہا ہو کہ تمام عورتیں میرے اوپر ایسی ہیں، تو جس سے بھی وہ نکاح کریگا اسے ہاتھ لگانے سے پہلے کفارہ دینا ہوگا۔ یہی رائے سعید بن المُسَیّب، عُروہ بن زبیر، عطاء بن ابی رَباح، حسن بصری اور اسحاق بن راہویہ کی ہے۔

شافعیہ کہتے ہیں کہ نکاح سے پہلے ظہار بالکل بے معنی ہے۔ ابن عباس اور قتادہ کی بھی یہی رائے ہے۔

۵- کیا ظہار ایک خاص وقت تک کے لیے ہو سکتا ہے؟ حنفی اور شافعی کہتے ہیں کہ اگر آدمی نے کسی خاص وقت کی تعیین کر کے ظہار کیا ہو تو جب تک وہ وقت باقی ہے، بیوی کو ہاتھ لگانے سے کفارہ لازم آئے گا، اور اس وقت کے گزر جانے پر ظہار غیر مؤثر ہو جائیگا۔ اس کی دلیل سلمہ بن صخر بیاضی کا واقعہ ہے جس میں انہوں نے اپنی بیوی سے رمضان کے لیے ظہار کیا تھا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے یہ نہیں فرمایا تھا کہ وقت کی تعیین بے معنی ہے بخلاف اس کے امام مالک اور ابن ابی لیلیٰ کہتے ہیں کہ ظہار جب بھی کیا جائے گا، ہمیشہ کے لیے ہوگا اور وقت کی تخصیص غیر مؤثر ہوگی، کیونکہ جو حرمت واقع ہو چکی ہے وہ وقت گزر جانے پر آپ سے آپ ختم نہیں ہو سکتی۔

۶- مشروط ظہار کیا گیا ہو تو جس وقت بھی شرط کی خلاف ورزی ہوگی، کفارہ لازم آجائے گا۔ مثلاً آدمی بیوی سے یہ کہتا ہے کہ "اگر میں گھر میں آؤں تو میرے اوپر تُو ایسی ہے جیسے میری ماں کی پیٹھ"۔ اس صورت میں وہ جب بھی گھر میں داخل ہوگا، کفارہ ادا کیے بغیر بیوی کو ہاتھ نہ لگا سکے گا۔ (باقی)

اسلامی قانونِ تعزیرات

ڈاکٹر عبدالعزیز عامر

ترجمہ: معروف شاہ شیرازی

(۵)

تعزیر، اللہ کا حق بھی ہے اور فرد کا حق بھی فقہا تمام دوسرے حقوق کی طرح تعزیر کی بھی دو قسمیں بیان کرتے ہیں۔ ایک وہ تعزیر جو اللہ کے حق کے طور پر ہو، دوسری وہ جو انسان کے حق کے طور پر۔[1]

قانون کے معاملہ میں حق اللہ سے مراد یہ ہے کہ جو امور مفادِ عام سے تعلق رکھتے ہوں، یا جن میں عام لوگوں کو نقصان سے بچانا مقصود ہو اور کسی ایک شخص خاص تک نقصان محدود نہ ہو، ایسے تمام امور کے بارے میں شریعت کے احکام حق اللہ سے تعلق رکھتے ہیں جبکہ دنیا کے وضعی قوانین میں اس کو پبلک کا حق قرار دیا جاتا ہے۔ لہٰذا اگر کوئی شخص کسی ایسے بُرے فعل کا ارتکاب کرے جس میں شارع کی طرف سے کوئی حد مقرر نہ ہو، اور اس فعل سے کسی خاص شخص کو نقصان نہ پہنچایا گیا ہو، تو اس پر جو تعزیر دی جائے گی وہ حق اللہ کے طور پر ہوگی، کیونکہ معاشرے میں جرائم اور بُرائیوں کو روکنا اور ملک کو فساد سے محفوظ کرنا شرعی واجبات میں سے ہے۔ اس کا مقصد پوری امت کو مضرت سے بچانا اور عوامی مفاد کی حفاظت

---

[1] بعض فقہا نے حقوق اللہ کی آٹھ قسمیں بتائی ہیں۔ (۱) خالص عبادات مثلاً ایمان۔ (۲) خالص سزائیں مثلاً حدود (۳) وہ سزائیں جو نااہل قرار دے دیتی ہیں مثلاً میراث سے محرومی۔ (۴) وہ حقوق جو سزا اور عبادت کے درمیان درمیان ہوں مثلاً کفارات۔ (۵) وہ عبادات جن میں آدمی پر مالی بار بھی ڈالا جاتا ہے جیسے صدقہ فطر۔ (۶) وہ مالی بار جن میں عبادت کا پہلو بھی ہے جیسے عُشر۔ (۷) وہ مالی بار جس میں عقوبت سے بھی ایک طرح کی مشابہت ہے جیسے خراج۔ (۸) وہ حق جو بذاتِ خود قائم ہو جیسا کہ خُمس اور غنائم کا معاملہ ہے۔ اس تقسیم پر ڈاکٹر عبدالرزاق سنہوری کا یہ تبصرہ خوب ہے کہ اللہ کے حقوق کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اس میں دین اور قانونِ عام (PUBLIC LAW) ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں اور مالی اور فوجداری قوانین کے دائرے خلط ملط ہو جاتے ہیں (دیکھیے التلویح ص ۷۰۵۔ مصادر الحق فی الفقہ الاسلامی مع المقارنۃ بالفقہ الغربی۔ یہ ان لیکچرز کا مجموعہ ہے جو استاذ عبدالرزاق سنہوری نے عرب لیگ سے متعلق شعبۂ تعلیماتِ عالیہ میں دیئے تھے۔ طبع ۱۹۵۴ء ص ۴۴)

کرنا ہے۔

حقِ فرد یا حق عبد (PRIVATE RIGHT) وہ ہے جس کا تعلق سوسائٹی کے افراد میں سے کسی ایک فرد یا مخصوص افراد کی مصلحت سے ہو۔

تعزیرات کے معاملے میں ان دونوں حقوق کے درمیان کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ بعض سزائیں خالص حق اللہ کے طور پر دی جاتی ہیں اور ان میں فرد کا حق بالکل نہیں ہوتا۔ مثلاً نماز نہ پڑھنے والے، شراب پینے والے عذرِ شرعی کے بغیر رمضان کا روزہ نہ رکھنے والے اور شراب نوشی کی مجلس میں شریک ہونے والے کو جو تعزیری سزا دی جاتی ہے اس میں واضح طور پر خالص اللہ کا حق کارفرما ہوتا ہے۔ کیونکہ اس میں محض عوام کا مفاد مضمر ہوتا ہے اور اجتماعی طور پر عام لوگوں کو خطرے سے بچانا مطلوب ہوتا ہے۔ اِن جرائم سے کسی خاص فرد کا کوئی خاص نقصان نہیں ہوتا جس کی وجہ سے ہم اُسے ایسی تعزیر کہہ سکیں جو بطورِ حقِ فرد واجب ہوتی ہے۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ تعزیر میں اللہ کا حق اور فرد کا حق دونوں مخلوط ہوتے ہیں لیکن خدا کا حق غالب ہوتا ہے۔ مثلاً دوسرے کی بیوی سے بوس و کنار اور اس سے تخلیہ میں ملنے پر (جبکہ زنا کا کوئی ثبوت نہ ہو) جو تعزیری سزا نافذ ہوتی ہے اس میں ایک لحاظ سے حقِ فرد بھی موجود ہوتا ہے۔

بعض فقہاء نے یہ بھی کہا ہے کہ بعض اوقات تعزیری سزا خالص حقِ فرد کے طور پر دی جاتی ہے۔ مثلاً ایک نابالغ لڑکا اگر کسی کو گالی دے دیتا ہے تو اسے جو تعزیری سزا دی جائے گی وہ خالص اُس فرد کا حق ہو گا جسے گالی دی گئی ہے کیونکہ نابالغ حقوق اللہ کا مکلّف نہیں ہے۔

کبھی یُوں بھی ہوتا ہے کہ تعزیر کے معاملہ میں اللہ اور انسان دونوں کے حقوق کارفرما ہوتے ہیں، لیکن اس میں حقِ فرد غالب ہوتا ہے۔ مثلاً گالم گلوچ اور ہاتھا پائی کی تعزیری سزا۔ اس معاملہ میں جرم کی نوعیت یہ ہے کہ ایک طرف تو ستم رسیدہ شخص کی عزت، وقار اور شرف پر دست درازی کی گئی ہے یا اس کو جسمانی مضرت پہنچائی گئی ہے، اور اس کا تعلق اس کے انفرادی حق سے ہے۔ دوسری طرف اس میں اللہ کے حق پر بھی دست درازی ہے، کیونکہ شارع کے احکام کی پابندی اور بندگانِ خدا کو اذیت پہنچانے سے باز رہنا اللہ کے حقوق میں سے ہے۔[۱]

---

[۱] دیکھیے شرح طوالع الانوار، شرح السندی علی الدر المختار، ج ۳، ورق نمبر ۲۰۶ کے دونوں صفحے اور ۲۰۶ کے دونوں

حقوق کی دونوں اقسام میں فرق کی اہمیت | تعزیر کی ان دو اقسام، یعنی واجب بطور حق اللہ اور واجب بطور حقِ فرد کے درمیان فرق کی اہمیت متعدد مواقع پر ظاہر ہوئی ہے جس کی چند مثالیں یہ ہیں :

۱- جو تعزیر بطور حق فرد واجب ہوتی ہے یا جس میں فرد کا حق غالب ہوتا ہے (مثلاً سب و شتم اور ہاتھا پائی کے معاملہ میں)، اور اس کا نفاذ ضرر رسیدہ شخص کے دعوے (COMPLAINT) پر موقوف ہوتا ہے۔ اس کا مطالبہ جب مستحق شخص کی طرف سے ہو تو فریاد رسی لازم ہو جاتی ہے، اور جب تک مستغیث مطالبے پر قائم رہے قاضی اسے ساقط نہیں کر سکتا۔ تعزیر کی اس قسم کے معاملہ میں حاکم وقت کی جانب سے معافی یا سفارش بھی ناجائز ہے۔ رہی وہ تعزیر جو بطور حق اللہ واجب ہے، اس میں حاکم وقت کی طرف سے معافی اور سفارش دونوں جائز ہیں، بشرطیکہ اس میں مصلحت ہو اور مجرم کی اصلاح سزا کے سوا دوسرے ذرائع سے ہو سکتی ہو۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک روایت میں آیا ہے۔ اِشْفَعُوْا اِلَیَّ وَیَقْضِی اللّٰہُ عَلٰی لِسَانِ نَبِیِّہٖ مَا یَشَاءُ (مجھ سے سفارش کرو، اگرچہ اللہ اپنے نبی کی زبان سے وہی فیصلہ کرائے گا جو وہ چاہے گا۔)[1]

تعزیر کی اس دوسری قسم کے بارے میں اختلاف ہے کہ حاکمِ وقت پر اس کا نفاذ واجب ہے یا نہیں۔ امام مالکؒ، امام احمدؒ اور امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ جن امور میں اس قسم کی تعزیر منصوص و مشروع ہے ان میں اس کا نفاذ واجب ہے۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ اس کا نفاذ واجب نہیں ہے اور اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں کہ ایک شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور اس نے عرض کیا کہ ایک عورت مجھے ملی اور میں مجامعت کے سوا اس سے سب کچھ کر ڈالا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "کیا تو نے ہمارے ساتھ نماز ادا نہیں کی؟" اس نے جواب دیا: "ہاں" نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے

مجھے۔ یہ کتاب ازہر کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی کتابت ذی القعدہ ۷۹۴ھ میں ختم ہوئی۔ الفصول الخمسۃ عشر فیما یوجب التعزیر وما لا یوجب وغیر ذلک، علامہ الاستروشنی ص ۵ اور اس کے بعد۔ الاحکام السلطانیۃ الماوردی، صفحہ ۲۲۵ اور اس کے بعد۔ الاحکام السلطانیہ، ابویعلیٰ، ص ۲۶۵ اور اس کے بعد۔ مصادر الحق فی الفقہ الاسلامی ڈاکٹر عبدالرزاق سنہوری، ص ۴۴ اور اس کے بعد۔

[1] دیکھیے حاشیہ ابن عابدین، ج ۳، ص ۱۹۲ اور اس کے بعد۔ الفصول الخمسۃ عشر فی التعزیر، الاستروشنی ص ۳ اور اس کے بعد۔ الاحکام السلطانیۃ، الماوردی، ص ۲۲۵ اور اس کے بعد۔

یہ آیت پڑھی اِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ (بے شک نیکیاں بُرائیوں کو دُور کر دیتی ہیں)۔ نیز وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کی اس حدیث سے بھی استدلال کرتے ہیں کہ آپ نے انصار کے بارے میں فرمایا اقبلوا من محسنہم وتجاوزوا عن مسیئہم (اُن کے نیکی کرنے والوں کی نیکی قبول کرو اور ان کے بدی کرنے والوں کی بُرائی سے درگزر کرو)۔

نیز وہ اس واقعہ سے بھی استدلال کرتے ہیں کہ جب ایک مقدمہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلّم نے حضرت زبیرؓ کے حق میں فیصلہ دیا تو اس فریقِ مخالف نے آپ کو مخاطب کر کے کہا "زبیر آپ کے پھوپھی زاد بھائی ہیں نا"۔ اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ آپ نے اپنے بھائی کی رعایت کر کے انصاف نہیں کیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم اس پر ناراض ہوئے مگر آپ نے اسے سزا نہ دی۔ بعض دوسرے فقہاء جن میں چند حنابلہ بھی شامل ہیں، کہتے ہیں کہ جن جرائم کی سزا منصوص ہے ان میں تو حکم کی تعمیل واجب ہے، مثلاً بیوی کی لونڈی سے مجامعت یا مشترکہ لونڈی سے مجامعت اور جن کے بارے میں کوئی نص نہیں ہے ان میں اگر مصلحت کا تقاضا یہی ہو کہ سزا دی جائے، یا مجرم کو جرم سے باز رکھنا سزا کے سوا کسی اور ذریعہ سے ممکن نہ ہو تو سزا دینا واجب ہے، کیونکہ تعزیر بطور حق اللہ مشروع ہے اور اس سے جرائم کا دفعیہ مطلوب ہے اس لیے حد کی طرح اس کا نفاذ بھی واجب ہے۔ ہاں اگر یہ معلوم ہو جائے کہ مجرم کی اصلاح سزا کے نفاذ کے بغیر بھی ہو سکتی ہے تو سزا دینا واجب نہ ہوگا اور حاکمِ وقت کے لیے جائز ہوگا کہ مجرم کو معاف کر دے اگر معافی میں ہی اس کو مصلحت نظر آئے۔ یہ حضرات امام شافعیؒ کی پیش کردہ احادیث سے یہی نتیجہ اخذ کرتے ہیں۔ لیکن یہ ساری باتیں صرف اس تعزیر کے معاملہ میں ہیں جو بطور حق اللہ واجب ہو۔ ان کا کوئی تعلق اس تعزیر سے نہیں ہے جو فرد کے حق کی بنا پہ واجب ہوتی ہے جیسا کہ ہم پہلے کہہ آئے ہیں۔

اصولی طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جو تعزیر اللہ کے حق پر مبنی ہو اسے نافذ کرنا حاکمِ وقت پر واجب ہے اور اس میں معافی، برات اور مصالحت جائز نہیں ہے، البتہ حاکم کو یہ اختیار ہے کہ اگر اس کی رائے میں مجرم کو معاف کر دینا زیادہ مناسب ہو، یا وہ یہ سمجھے کہ سزا کے بغیر مجرم کی اصلاح ہو سکتی ہے تو سزا نافذ نہ کرے۔ اوپر جس شخص کا قصہ گزرا ہے کہ مباشرت کے سوا وہ ایک عورت کے ساتھ سب کچھ کر گزرا، اسے نبی صلی اللہ علیہ وسلّم نے اسی لیے تو سزا نہیں دی کہ وہ پکڑا نہیں گیا تھا بلکہ خود تائب اور نادم ہو کر حاضر

ہوا تھا۔ آپ نے محسوس فرمایا کہ یہ تو خود ہی جرم سے باز رہنے کے لیے تیار ہے، اسے سزا دینے کی کیا ضرورت ہے رہا وہ واقعہ جو اوپر مذکور ہوا کہ ایک شخص نے حضورؐ کا فیصلہ سُن کر آپ کے انصاف پر حملہ کیا، تو اس میں معاملہ بندے کے حق کا تھا اور بندے کو اختیار ہے کہ اپنے حق پر زیادتی کو معاف کر دے۔ بالفاظِ دیگر حملہ کرنے والے نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے انصاف پر حملہ کر کے آپ کی ذات کو نشانہ بنایا تھا اور آپ نے اپنے حق پر اس کی زیادتی کو معاف فرما دیا۔[۱]

یہاں یہ بیان کر دینا بھی مناسب ہو گا کہ جو تعزیر بطورِ حقِ فرد واجب ہے اسے اگر صاحبِ حق معاف بھی کر دے یا مصالحت قبول کرے تب بھی حاکمِ وقت کو یہ اختیار حاصل ہے کہ اصلاح و تادیب کی خاطر مجرم کو سزا دے، کیونکہ اس کا یہ فرض ہے کہ ملک کو جرائم سے پاک کرے اور ان کے سدباب کے لیے مناسب تدبیر اختیار کرے۔ اس لیے اسے جرائم پر سزا دینے کا حق بہر حال حاصل رہتا ہے۔ اور اگر وہ سمجھے کہ معافی ہی میں مصلحت ہے یا یہ کہ مجرم کی اصلاح سزا کے بغیر بھی ہو سکتی ہے تو سزا کو ترک بھی کر سکتا ہے۔[۲]

۴۔ حق اللہ اور حق الفرد میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ جو تعزیر بطورِ حقِ فرد واجب ہوتی ہے اس میں تداخل (AMALGAMATION) نہ ہو گا، یعنی جرم کی تکرار سے سزا بھی مکرر ہو گی۔ مثلاً اگر کسی نے مختلف اوقات میں کسی کو گالیاں دیں تو بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ قاضی مجرم کو اس کے ہر جرم کی علیحدہ سزا دے گا۔ لیکن جو سزا بطورِ حق اللہ واجب ہے اس میں تداخل ہو سکتا ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص ماہِ رمضان میں عمداً کئی بار روزہ نہ رکھے تو تمام روزے چھوڑنے کے لیے اسے ایک ہی سزا دی جائے گی۔[۳]

کشاف القناع میں ایک دوسری رائے کا اظہار بھی کیا گیا ہے، وہ یہ کہ اگر کسی شخص پر مختلف جرائم کے

---

[۱] دیکھیے، حاشیہ ابن عابدین، ج ۳، ص ۱۹۲ اور اس کے بعد۔ الاستروشنی، فی التعزیر ص ۵ اور اس کے بعد۔ شرح طوالع الانوار، شرح السندی علی الدر المختار ج ۷، ورق ۴۳۶، ص اول، ورق ۴۳۷، ص اول، ورق ۴۳۸، ص اول۔ کشاف القناع عن متن الاقناع، ج ۴، ص ۷۴۔ المغنی، ابن قدامہ، ج ۱۰، ص ۳۴۸، ۳۴۹۔ الشرح الکبیر جو المغنی کے ساتھ ہی چھپی ہے، ص ۲۶۲، ۲۶۳

[۲] الاحکام السلطانیہ، الماوردی، ص ۲۲۵ اور اس کے بعد۔

[۳] شرح طوالع الانوار، شرح السندی علی الدر المختار ج ۷، ورق ۴۳۶، ص ۲۔ مصادر الحق فی الفقہ الاسلامی، ڈاکٹر عبدالرزاق سنہوری، ص ۵۴ اور اس کے بعد۔

الزامات ہوں اور ان کا تعلق خالص حق اللہ سے ہو، تو خواہ ان کی نوعیت ایک جیسی ہو، مثلاً کسی نے اجنبی عورت کا کئی بار بوسہ لیا ہو، یا نوعیت مختلف ہو، مثلاً ایک اجنبی عورت کا بوسہ لیا اور دوسری کو عمداً چھوا، تو دونوں صورتوں میں تعزیرات میں تداخل ہو جائے گا اور صرف ایک سزا ہی کافی ہوگی، جیسے جرم زنا میں ہوتا ہے کہ متعدد مرتبہ زنا کرنے کا الزام ہو تب بھی سزا ایک ہی دی جائے گی۔ اسی طرح جن جرائم کی سزائیں بطورِ حق فرد واجب ہوں ان میں بھی ایک ہی شخص کو متعدد بار گالی دینے، یا بہت سے اشخاص، حتیٰ کہ ایک پوری بستی کو گالی دینے کی سزاؤں میں بھی تداخل ہو سکتا ہے جیسے تعزیر بطورِ حق اللہ میں ہوتا ہے۔ کیونکہ تعزیر سے مطلوب یہ ہے کہ مجرمین کی اصلاح ہو اور جرائم کا سدباب ہو۔ اس کا لازمی تقاضا یہ نہیں ہے کہ جتنے افعال ہوں اتنی ہی سزائیں دی جائیں۔ ہٰذا تعزیرات خواہ بطورِ حق اللہ واجب ہوں یا بطورِ حق فرد واجب ہوں، اس لحاظ سے ان کے درمیان فرق کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے[1]۔

۳- تعزیر کی ان دو اقسام کے درمیان ایک فرق یہ بھی ہے کہ جو تعزیر بطورِ حق اللہ واجب ہو اس کا نفاذ ہر وہ شخص کر سکتا ہے جس کے سامنے جرم کا ارتکاب کیا جا رہا ہو۔ کیونکہ ایسے معاصی نہی عن المنکر اور ازالۂ منکر کے ضمن میں آتے ہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے کہ "تم میں کوئی بھی کسی منکر کا ارتکاب ہوتے دیکھے تو اسے اپنے ہاتھ سے زائل کرے اگر نہ کر سکے تو زبان سے دور کرنے کی کوشش کرے، اگر اس کی استطاعت بھی نہ ہو، تو دل سے اسے برا جانے اور یہ ایمان کا ضعیف ترین درجہ ہے"۔ البتہ اگر جرم کا ارتکاب ہو چکا ہو تو پھر تعزیر کے نفاذ کا حق حکام کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ اس کی علت یہ بیان کی گئی ہے کہ جرم کے ارتکاب کے وقت تو تعزیر کا نفاذ نہی عن المنکر کے دائرے میں آتا ہے اور ہر انسان کو اس کا حکم دیا گیا ہے۔ لیکن معصیت کا ارتکاب ہو چکنے کے بعد کسی شخص کا اس پر کوئی کارروائی کرنا نہی عن المنکر کے ضمن میں نہیں آتا کیونکہ جس برائی کا ارتکاب ہو چکا ہے اس سے روکنا ممکن ہی نہیں ہے۔ اس کے بعد تو جرم کی سزا دینے کا کا کام ہی باقی رہ جاتا ہے اور اس کا حق ہر شخص کو نہیں ہے بلکہ وہ صرف حکام وقت کا کام ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جرم ہوتے دیکھ کر اس کو روکنا یا اسے زائل کرنے کی کوشش کرنا سرے سے تعزیر ہے ہی نہیں۔ یہ تو ازالہ

[1] کشاف القناع عن متن الاقناع، ج ۴ ص ۷۳۔ نیز ملاحظہ ہو مصادر الحق ڈاکٹر عبدالرزاق احمد سنہوری، ص ۴۵ اور اس کے بعد۔

جرم کے تسلسل کو جاری رہنے سے روکنا ہے اور یہ ہر اس شخص کا فرض ہے جس کے سامنے جُرم کا ارتکاب کیا جا رہا ہو۔

یہ معاملہ ان جرائم کے ساتھ خاص ہے جن میں خالص حق اللہ کے لیے تعزیر واجب ہو۔ رہی وہ صورت جس میں تعزیر بطورِ حقِ فرد واجب ہو، تو ارتکابِ جُرم کے وقت ایسی تعزیرات کے اجراء کا حق ہر فرد کو نہیں ہے کیونکہ اس کا اِجرا شخصِ متضرر کے دعوے پر موقوف ہے اور حاکم کے سوا کوئی اور اس کے اجراء کا حق نہیں رکھتا، اِلّا یہ کہ کوئی طرفین کے درمیان بطورِ حَکَم (ARBITER) فیصلہ کر رہا ہو۔

ایک رائے یہ بھی ظاہر کی گئی ہے کہ جو تعزیر بطورِ حقِ فرد واجب ہے اس کی تعمیل صاحبِ حق کے اختیار میں ہے جیسے قصاص کا معاملہ ہے۔ لیکن صحیح بات یہ ہے کہ تعزیر نافذ کرنا حکام کا کام ہے۔ شخصِ متضرر کے اختیار میں اس کو دے دینے کے معنی تو یہ ہوں گے کہ تعزیر میں زیادتی ہونے لگے، کیونکہ تعزیر وہ سزا ہے جو شریعت میں حد کی طرح مقرر نہیں کر دی گئی ہے۔ نیز اسے قصاص پر قیاس بھی نہیں کیا جا سکتا کیونکہ قصاص میں سزا مقرر ہوتی ہے اور اس میں کمی بیشی نہیں ہو سکتی[1]۔ میں سمجھتا ہوں یہی رائے قابلِ قبول اور مزاجِ شریعت کے قریب تر ہے۔ اس میں ظلم کا امکان بھی نہیں رہتا اور زیادہ محتاط صورت بھی ہے۔ کیونکہ اس کا نفاذ اگر شخصِ متضرر پر چھوڑ دیا جائے تو لازماً وہ سزا میں زیادتی کرے گا۔ ایسے حالات میں متضرر، جذبۂ انتقام میں سرشار ہوتا ہے جس سے کم ہی کوئی انسان ایسے حالات میں خالی ہوا کرتا ہے، اور اس صورت میں کوئی چیز ایسی نہیں ہو سکتی جو اسے ایک حد پر روک دے۔

۴۔ ایک فرق یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ جو تعزیر بطورِ حقِ فرد واجب ہوتی ہے اس میں شخصِ متضرر کا حق اس کے وارثوں کی طرف منتقل ہوتا ہے اگرچہ مُجرم کا جرم اس کے وارثوں کی طرف منتقل نہیں ہوتا۔ مطلب یہ ہے کہ کسی ضرر رسیدہ شخص کی وفات کے بعد اس کے وارث تعزیر کے نفاذ کا مطالبہ کر سکتے ہیں، لیکن اگر مضرت دینے والا شخص فوت ہو جائے تو ضرر رسیدہ شخص یا اس کے وارث یہ مطالبہ نہیں کر سکتے کہ مجرم کے وارثوں کو سزا دی جائے۔ بخلاف اس کے جو تعزیر بطورِ حق اللہ واجب ہوتی ہے اس میں وراثت کسی صورت میں بھی جاری نہیں ہوتی کیونکہ اللہ کے حقوق کا وارث کوئی نہیں ہوتا۔ اس بناء

---

[1] الفصول الخمسہ عشر فیما یوجب التعزیر وما لا یوجب، الاستروشنی، ص ۴، ۵۔ ردّ المحتار علی الدّرِ المختار، ج ۳، ص ۱۸۶، ۱۸۷۔ نیز تقابل کے لیے ملاحظہ ہو مصادرُ الحق فی الفقہ الاسلامی۔ ڈاکٹر عبدالرزاق احمد سنہوری ص ۵۴ اور اس کے بعد۔

پر نہ مجرم کے وارثوں کو ان کے مورث کے جرم کی وجہ سے سزا دی جائے گی اور نہ جس شخص کے خلاف جرم کیا گیا ہے اس کے وارث نفاذِ تعزیر کا مطالبہ کرنے کے حق دار ہوں گے۔ اگر مجرم فوت ہو چکا ہو تو اس صورت میں تو بات واضح ہے۔ لیکن شخص متضرر کے فوت نہ ہونے کی صورت میں بھی بات یہی ہو گی۔ کیونکہ جو تعزیر بطور حق اللہ واجب ہے اس کا نفاذ تو خود متضرر کے مطالبے پر بھی موقوف نہیں ہے کجا کہ اس کے وارثوں کو اس کے مطالبے کا حق پہنچے[1]

(باقی)

---

[1] مصادر الحق فی الفقہ الاسلامی۔ ڈاکٹر عبدالرزاق السنہوری، ص ۴۵ اور اس کے بعد۔

عراق کی صُورتِ حال

خلیل حامدی

عرب سوشلسٹ ریاستیں عرب ممالک کی سیاسیات پر نظر رکھنے والے اس امر سے بے خبر نہیں ہیں کہ ۱۳ عرب ممالک میں سے چار ملک ایسے ہیں جو اپنے آپ کو "سوشلسٹ انقلابی طاقت" (القوی الاشتراکیۃ الثوریہ) شمار کرتے ہیں۔ ان طاقتوں کی سربراہی مصر کے ہاتھ میں ہے، اور شام، الجزائر اور عراق اس کیمپ کے پُرجوش رکن ہیں۔ قارئینِ ترجمان کو مصر کے حالات سے ہم گاہے بگاہے متعارف کراتے رہے ہیں۔ شام کے سوشلزم اور حزب البعث کے خدوخال بھی پچھلے دو شماروں میں بیان کیے جاچکے ہیں۔ اب ہم آپ کے سامنے چوتھے درجے کی سوشلسٹ طاقت کے ملحق حال کا جائزہ لیتے ہیں۔ آئندہ انشاءاللہ الجزائر پر روشنی ڈالیں گے تاکہ اس کیمپ کے حدُودِ اربعہ اور عرب سیاسیات میں اس کے اثرات سے مکمل آگہی حاصل ہوسکے۔ اور یہ بھی معلوم ہوسکے کہ پچھلے ۲۰ سال میں، جبکہ اسرائیل پورے اطمینان کے ساتھ عرب ملکوں کی کمر توڑ دینے کے لیے جنگی تیاریاں کر رہا تھا، خود ان ملکوں کے اندر کیا کچھ ہوتا رہا ہے۔

انقلابِ عراق کے اسباب ۱۴ جولائی ۱۹۵۸ء کی صبح عراق میں بساطِ شاہی کے اُلٹ جانے کا پیغام لے کر طلوع ہوئی۔ عراق کے شاہی خاندان کا بچہ بچہ تلوار کے گھاٹ اُتار دیا گیا۔ عراق کے وزیراعظم نوری السعید کی برہنہ لاش گلیوں میں گھسیٹی گئی۔ چشمِ فلک نے ایک بار پھر بغداد میں وہ سماں دیکھ لیا جو چنگیز خاں اور ہلاکو کے عہد میں دیکھ چکی تھی۔ ملک کو اس خونیں انقلاب کے سپرد کرنے کا سہرا خود نوری السعید کے سر ہے۔ یُوں تو نوری بڑا آزمودہ کار اور زیرک سیاستدان سمجھا جاتا تھا اور بارہا عراق میں اُسے حکومت کرنے کا موقع ملا۔ مگر جولائی ۱۹۵۴ء سے اُس نے اپنی آخری وزارت جس نہج پر تشکیل کی اور جس ڈھب پر اُسے چلایا وہ اُس کی دُور اندیشی اور ژرف نگاہی کا ثبوت نہیں بلکہ اس کی حماقت اور کم نظری کی دلیل تھی۔ وطن پرست اور اسلام پسند، دونوں قسم کے عناصر

جیلوں میں ڈال دیئے گئے، سیاسی سرگرمیاں ممنوع قرار دے دی گئیں، اخبارات اور پریس کا نام و نشان ختم کر دیا گیا، بنیادی آزادیوں کا جنازہ نکال دیا گیا، ہر قسم کی تنقید کے دروازے بند کر دیئے گئے۔ فکر و نظر اور فہم و شعور پر مکمل خزاں چھا گئی۔ اور دوسری طرف اُس نے اپنے مطلق العنان اقتدار کے بل پر مغربی ممالک سے ایسے معاہدے کرنے شروع کر دیئے اور ملک کے اہم مسائل و معاملات پر ایسی پالیسیاں اختیار کرنی شروع کر دیں، جن سے ملک کے تمام لوگوں کا بہر حال مطمئن ہونا اور مطمئن رہنا ممکن نہ تھا۔ مگر چونکہ کسی طرف سے کسی عدمِ اطمینان کے اظہار اور کسی پالیسی پر تنقید کا کوئی موقع نہ تھا، اور ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی، اس لیے اس مصنوعی پُرسکون فضا کو دیکھ کر نوری یہ سمجھ بیٹھا کہ سب اچھا ہے۔ حالانکہ دراصل وہ احمق ملک ہی کے حق میں نہیں بلکہ خود اپنے اور اپنی اولاد کے حق میں بھی کانٹے بو رہا تھا۔ قدرت کا زیرِ زمین عادل نظام وہ زنجیریں تیار کر رہا تھا جن سے باندھ کر اُس کی عُریاں لاش کو بغداد کی گلیوں میں گھسیٹا جانا تھا۔ ۲۰ نومبر ۱۹۵۶ء کو، یعنی انقلابِ عراق کے ٹھیک ایک سال ۸ ماہ قبل، عراق کے تمام سیاسی اور غیر سیاسی اور دینی اور ادبی زعماء نے شاہ فیصل والیٔ عراق کو ایک میمورنڈم پیش کیا جس میں کہا گیا:

"جلالت مآب شاہِ عراق! نوری السعید نے جولائی ۱۹۵۴ء سے اپنی حالیہ وزارت تشکیل کی ہے۔ اب حالت یہ ہے کہ اس نے عوام کے حقوق پامال کر رکھے ہیں۔ شہری آزادیاں ختم ہیں۔ سیاسی زندگی معطل ہے۔ اخبارات کے ڈیکلریشن منسوخ کر دیئے گئے ہیں۔ پریس اور خبر رسانی کے تمام وسائل و ذرائع اس نے اپنے قبضہ میں کر رکھے ہیں۔ غیر ملکی اخبارات اور لٹریچر کا داخلہ بھی بند کیا جا چکا ہے۔ عوامی اجتماعات کے انعقاد کی اجازت نہیں ہے۔ دستوری آزادیوں کا گلا گھونٹ دیا گیا ہے۔ یہ تمام انتظامات بغداد پیکٹ کے نفاذ کا راستہ ہموار کرنے کے لیے ہیں۔ نوری السعید کو اندیشہ ہے کہ عوام اس پیکٹ کو قبول نہیں کریں گے۔ جب سویز پر سہ طاقتی حملہ ہوا تو نوری السعید نے فوراً ملک کے اندر ہنگامی حالات کا اعلان کر دیا۔ اور کثیر تعداد کو جیلوں میں بند کر دیا۔ ۔ ۔"

جلالت مآب! اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ حکومت کی پالیسیوں اور عوامی مطالبات کے اندر ہم آہنگی انتہائی ضروری ہے۔ یہ ہم آہنگی معدوم ہو جائے تو ایسی حکومت کا باقی رہنا قومی

مفاد اور ملکی سلامتی کے لیے خطرہ بن جاتا ہے۔ آپ کو مختلف اداروں، گروہوں اور شخصیتوں کے ذریعہ معلوم ہو چکا ہوگا کہ نوری السعید کی حکومت اور عوامی مطالبات کے اندر ہم آہنگی ختم ہو چکی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ اس وزارت کو فی الفور برطرف کر دیا جائے۔ یہ ایک نہایت اہم قومی اور ملی تقاضا ہے۔[1]"

عبدالکریم قاسم کا فوجی انقلاب مگر نوری نے فطرت کی اس آواز پر کوئی کان نہ دھرا۔ وہ خود بھی ختم ہوا اور اس کے سرپرست بھی نیست و نابود ہوئے، اور ملک کا مستقبل بھی ایک عرصہ تک کے لیے مزید اضطراب و تیرگی میں گھر گیا۔ اس کے تشددانہ اور سخت گیرانہ رویے کا سب سے بڑا نقصان جسے آج تک عراق بھگت رہا ہے یہ ہوا کہ تخریب پسند عناصر تو زیرزمین دوز سرگرمیوں میں مصروف ہو گئے اور میدان کو خالی پاکر انہوں نے خوب خوب اپنے لیے فضا ہموار کی، مگر کسی صحت مند سیاست کے علمبردار عنصر کے میدان میں نہ ہونے کی وجہ سے عوام کی صحیح تربیت اور تعمیری افکار کی اشاعت کا کام رک گیا۔ اس یک طرفہ ٹریفک کے نتیجے میں سیاسی توازن اور فکری اور نظریاتی اعتدال ختم ہو گیا اور آخر کار اسی کرب آمیز فضا میں عبدالکریم قاسم، عبدالسلام عارف اور دوسرے فوجی لیڈروں نے ایک فوری نقشۂ انقلاب تیار کیا اور غضب آلود فوجی افسروں کے ذریعہ اُسے عملی جامہ پہنایا اور پُرجوش اور انتقامی جذبات سے بھرپور عوام سے اُسے کامیاب کرایا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سابق حکمرانوں کا زن بچہ کولھو میں پیل دیا گیا اور کوئی آنکھ اُن پر آنسو بہانے والی نہ رہی۔ شاہی خاندان اور چند سابق وزراء اور سرکاری افسروں کی لاشیں کئی روز تک ننگے سڑکوں پر گھسیٹتے رہے اور بعض کی لاشیں بجلی کے کھمبوں سے لٹکتی رہیں۔ غضبناک فوجی افسروں کے ہاتھوں سے انقلاب کی یہ خونریز ولادت صاف پتہ دے رہی تھی کہ سرزمین عراق کسی اور بڑے حادثے کا نشانہ بننے والی ہے۔ کیونکہ اس طرح کے خونریز انقلابات بے اولاد نہیں رہتے بلکہ ان کی نسل چل پڑتی ہے، اور اس کی اصل ذمہ داری اُن احمقوں کے سر ہوتی ہے جنہوں نے ابتداءً عوام کی آزادیوں کا گلا گھونٹ کر پُرامن تغیرات کا دروازہ بند کیا تھا اور خونی انقلابات کو خود دعوت دی تھی۔

فوجی عدالت کی سزائیں انقلاب کے بعد "عوامی عدالت" (محکمۃ الشعب) قائم کی گئی۔ کرنل فاضل عباس مہداوی

---

[1] ملاحظہ ہو جریدہ "الشباب"، دمشق، شمارہ بابت یکم دسمبر ۱۹۵۶ء۔

کو، جو ایک منتسب کمیونسٹ تھا، اس کا صدر بنایا گیا[۱]۔ اس عدالت میں عہدِ ماضی کے "غداروں" پر مقدمات قائم کیے گئے اور انہیں موت اور عمر قید کی سزائیں دی گئیں۔ ایک سال کے اندر اندر ۹۳ ایسے ملزم اس "عدالت" میں پیش کیے گئے جن میں سے بیشتر کو معمولی سماعت کے بعد موت کی سزائیں سنائی گئیں اور دوسروں کو عمر قید جس شخص سے بھی انتقام لینا مقصود تھا اُسے "غداری" کے الزام میں اس عدالت میں کھڑا کیا گیا اور "قرار واقعی" سزا دی گئی۔ فوجی انقلاب نے اگر کوئی کسر اٹھا رکھی تھی تو وہ اس "عوامی عدالت" نے پوری کر دی۔ پورا عراق اس "عدالت" کے فیصلوں سے کانپ اٹھا اور یہ بات کھل کر سامنے آنا شروع ہو گئی کہ یہ انقلاب "سرخ عناصر" کے ہاتھوں میں جا رہا ہے۔

انقلابی گروہ میں اختلاف | دوسری طرف انقلاب کی غائبانہ اسکیم کے نتائج اُبھرنے شروع ہو گئے۔ انقلاب کے بعد جب بادشاہت کی تنسیخ، دستوری اختیارات اور جمہوریہ عراقیہ کے قیام کی بحث شروع ہوئی تو فوجی افسروں کے اندر اختلافات پیدا ہو گئے۔ فوج دو واضح گروپوں میں بٹ گئی۔ ایک عبدالکریم قاسم کا گروپ جس کی پشت پناہی فوج اور سول کا کمیونسٹ عنصر کر رہا تھا، اور دوسرا گروپ نجیب الربیعی، عبدالسلام عارف، ناظم طبقجلی اور رفعت سری کا تھا جسے وطن دوست اور اسلامی ذہن رکھنے والے عناصر کی حمایت حاصل تھی۔ اول الذکر گروپ عراق کو عرب ممالک سے الگ رکھ کر روسی کیمپ کے ساتھ وابستہ کرنا چاہتا تھا اور مؤخر الذکر عرب اتحاد کا حامی تھا، بلکہ متحدہ عرب جمہوریہ میں اسے مدغم کرنا چاہتا تھا

عبدالکریم قاسم نے پہلی وزارت جو تشکیل کی وہ بالکل متضاد عناصر سے مرکب تھی۔ اس میں وزارتِ عظمیٰ کا عہدہ اور مسلح افواج کی قیادت کا منصب اس نے اپنے ہاتھ میں رکھا۔ عبدالسلام عارف کو نائب وزیراعظم اور نائب کمانڈر اور وزیرِ داخلہ کا عہدہ سپرد کیا۔ اور باقی اکثر و بیشتر وزارتیں کمیونسٹ پارٹی، بعث پارٹی اور عرب قوم

---

[۱] واضح رہے کہ نوری السعید کے زمانہ میں کسی کو یہ خیال بھی نہ تھا کہ عراق میں کوئی کمیونسٹ پارٹی بھی ہے لیکن نوری نے شہری آزادیوں پر جو پہرے بٹھا رکھے تھے ان کی بدولت آئینی طریقوں پر بالائے زمین کام کرنے والوں کے لیے تو تمام راستے بند ہو گئے مگر زیرِ زمین کام کرنے والوں کا راستہ وہ نہ روک سکا۔ وہ اندر ہی اندر اپنی جڑیں پھیلاتے رہے، حتیٰ کہ فوج تک میں گھس گئے۔

پرستوں میں تقسیم کر دی گئیں۔

عبدالکریم قاسم اور عبدالسلام عارف میں پھوٹ: عبدالسلام عارف ذاتی لحاظ سے شریف اور نیک دل انسان تھا۔ دینی عناصر کے ساتھ اس کے تعلقات اچھے تھے مگر اس سے ایک سخت غلطی سرزد ہوئی۔ انقلاب کے بعد اس نے یہ کوشش شروع کر دی کہ عراق اتحادِ عرب میں شامل ہو تاکہ کمیونسٹوں کے چنگل سے محفوظ ہو جائے۔ اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے اس کے پاس سب سے زیادہ موزوں سہارا اسلام پسند عنصر تھا مگر عراق میں اسلام پسند عنصر سے مراد اخوان المسلمون تھے اور اخوان المسلمون کا گروہ خواہ وہ مصر سے تعلق رکھتا ہو یا عراق و شام سے، جمال عبدالناصر کی نظر میں یکساں طور پر ناپسندیدہ اور معتوب تھا۔ عبدالسلام عارف نے مصر و شام کے ساتھ اپنے روابط مضبوط کرنے کے لیے اس گروہ کا تعاون مفید نہ پاکر دوسرے عناصر کی طرف رُخ کر لیا۔ دوسرے عناصر سے مراد بعث پارٹی اور قوم پرست تھے۔ بعث پارٹی اگرچہ سوشلزم کی علمبردار تھی مگر ایک مؤثر ہتھکنڈے کے طور پر وہ وحدتِ عربیہ کی داعی بھی تھی۔ قوم پرست ہر اُس بات پر صاد کہنے والے تھے جو قاہرہ سے صادر ہوتی تھی۔ اسلام پسند عنصر سے عبدالسلام مرحوم نے آنکھیں پھیر لیں اور ان نئے ساتھیوں کے ساتھ راہ و رسم پیدا کرنی شروع کر دی۔ عراق کا کمیونسٹ عنصر اپنی مخصوص تکنیک کی وجہ سے عراق کو عرب ممالک سے بالکل الگ تھلگ رکھ کر اُسے خالص کمیونسٹ اسٹیٹ بنانا چاہتا تھا۔ اور عبدالکریم قاسم جیسا خودسر اور خودپسند اور خودپرست لیڈر اُن کے لیے بے حد موزوں تھا۔ عبدالکریم قاسم کے دستِ راست وصفی طاہر کو فوج اور سول کے کمیونسٹ عناصر نے اپنا آلۂ کار بنایا اور اس کے ذریعہ سے عبدالکریم قاسم اور عبدالسلام عارف کے درمیان اختلاف کو ہوا دینی شروع کر دی۔ عبدالسلام عارف کے بارے میں اُس نے یہ تاثر دیا کہ اس شخص کے پاس بغداد میں فوجی افسروں کا ایک مضبوط گروہ ہے اور وہ کسی وقت بھی قاسم حکومت کا تختہ الٹ سکتا ہے۔ اُدھر فوج کا آزاد گروپ عبدالسلام عارف سے یہ مطالبہ کر رہا تھا کہ وزارت خالصتہً عسکری ہونی چاہیے اور سول سے جو کمیونسٹ وزرا لیے گئے ہیں انہیں نکال باہر کرنا چاہیے۔

عبدالکریم قاسم کا خدشہ مزید بڑھ گیا، اور اُسے اپنا وہی حشر نظر آنے لگا جو مصر میں جنرل نجیب کا ہو چکا تھا۔ چنانچہ اس نے بلا تامل عبدالسلام عارف کو تمام مناصب سے محروم کر کے بون میں سفیر بنا کر بھیج دیا یعنی

اور قوم پرست عناصر اس بنا پر مطمئن تھے کہ انہوں نے عبد السلام عارف جیسی با اثر شخصیت کو اپنے ساتھ ملا لیا ہے۔ مگر اندرونی طور پر جو لاوا پک رہا تھا وہ یکایک اُبل پڑا اور حالات پر کمیونسٹوں نے پُوری طرح غلبہ حاصل کر لیا۔ عبد السلام عارف کو بون سے واپس بلا لیا گیا اور بعض خود ساختہ الزامات لگا کر اُسے جیل بھیج دیا گیا۔ اب فوج اور سول کے اندر عام پکڑ دھکڑ کا سلسلہ شروع ہوُا اور گرفتار شدگان کو "ملٹری کورٹ" میں پیش کیا گیا۔ عبد السلام عارف کو ملٹری کورٹ کی طرف سے سزائے موت سنا دی گئی۔

کمیونسٹ اقتدار کا قیام | اس طرح ملک میں کمیونسٹ حکومت قائم ہو گئی اور کمیونسٹوں نے پندارِ حکومت کے نشے میں اسلام اور مسلمانوں پر تند و تیز حملے شروع کر دیئے۔ نہ صرف اسلام بلکہ عرب قوم پرستی اور عرب اتحاد کا مذاق بھی اڑایا گیا۔ بغداد ریڈیو مصر کے حکمران کو "ناصر الاستعمار" (استعمار کا معاون) کہتا اور قاہرہ ریڈیو عراق کے سربراہ کو "قاسم العراق" (عراق کے حصے بخرے کرنے والا) کے لقب سے پکارتا۔ ایک "بطلِ عرب" (عرب کا ہیرو) تھا اور دوسرا "الزعیم الاوحد (یکتا و یگانہ لیڈر)۔ کمیونسٹوں نے اسی دَور میں عراق میں ایک کتاب شائع کی جس کا نام تھا: "اللّٰہُ فی قفص الاتہام (خدا ملزموں کے کٹہرے میں[1]) غیر کمیونسٹ اخبارات بند کر دیئے گئے۔ پریس اور وسائل نشر و اشاعت کا استعمال ہر غیر کمیونسٹ کے لیے ممنوع قرار دیا گیا۔ مسجدوں اور تعلیمی اداروں کے اندر خدا، قرآن اور رسول پر حملے کیے گئے۔ اردگرد کے تمام ممالک کو یقین

---

[1] ایک طرف خدا کا مذاق اڑایا گیا اور دوسری طرف عبد الکریم قاسم کو "ربِّ تموز" (جولائی کا رب) کہا گیا۔ انقلابی حکومت کی طرف سے انقلاب کی پہلی سالگرہ پر جو کتاب شائع ہوئی ہے اُس کی پیشانی پر یہ شعر درج ہے:

یا ربّ تموز اکبارا اجلّہ لما صنعت وللتاریخ ماکتبا

لأنت من سنظل الدہر تذکرہ مالاح نجم علی الدنیا وما غربا

شاعر عبد الکریم قاسم سے خطاب کرتے ہوئے کہتا ہے: "اے جولائی کے رب! تو نے جو کارنامہ سرانجام دیا ہے اور جریدۂ تاریخ پر جو نقش ثبت کیا ہے اُس کے احترام میں مَیں نے یہ معلومات قلمبند کی ہیں تو وہ ہستی ہے کہ جب تک دنیا میں سلسلۂ روز و شب جاری ہے ہم آپ کا ذکر کرتے رہیں گے (ملاحظہ ہو کتاب: ثورۃ اربعۃ عشر تموز فی عامہا الاوّل" شائع کردہ حکومتِ عراق، مطبوعہ دار الاخبار، بغداد، جولائی ۱۹۵۹ء)

ہوگیا کہ "عراق تاشقند اور بخارا کی صف میں شمار ہونے والا ہے" زمینداریوں کی تنسیخ اور تحدید اور کارخانوں کو قومی ملکیت میں لینے کے احکام صادر ہوئے۔ اور جو ادارے قومی تحویل میں لیے گئے ان کا کوئی معاوضہ نہ دیا گیا کمیونسٹوں کی لوٹ کھسوٹ اور ان کی مغرورانہ روش سے عوام الناس کا عرصۂ حیات تنگ ہوگیا۔ اور وہ بیسویں صدی کے تاتاریوں کے بے رحم ہاتھوں میں گرفتار ہوگئے

کمیونزم سے عوام کی بیزاری عراق کی جذباتی اور سیماب صفت قوم اس مصنوعی تغیر اور جفا پیشہ اقتدار کو آسانی سے ہضم کرنے والی نہ تھی۔ عراق کے مسلم عوام اور مذہبی رہنما، شیعہ بھی اور سنّی بھی، عرب بھی اور کرد بھی، سب حالات کے جدید رُخ پر سیخ پا تھے۔ فوج کا اسلام پسند گروپ بھی معتوب ہونے کے باوجود فعّال عمل تھا۔ اب حالات صاف بتا رہے تھے کہ ملک پھر ایک خونی انقلاب کے لیے تیار ہے۔ فوج کے دو بڑے عہدیدار، ناظم طبقجلی اور رفعت سرّی اپنی وطن دوستی، دین پسندی اور جرأت و بے خوفی کی وجہ سے مرکز توجہ اور امید گاہِ مستقبل بن گئے۔ انقلابِ جولائی میں بھی ان کا بڑا ہاتھ تھا مگر اس انقلاب کی عاجلانہ اسکیم کی وجہ سے حالات ان کے قابو سے باہر ہوگئے تھے۔

شواف کی بغاوت اور قاہرہ مارچ ۱۹۵۹ء کو عراق ایک اور دور میں داخل ہوگیا۔ قاہرہ کے جاسوس جو اسرائیل کے بجائے خود عربوں کے پیچھے لگے ہوئے تھے، یہ سُن گن پا گئے کہ ناظم طبقجلی اور رفعت سرّی فوجی اور قومی پیمانے پر انقلاب کی تیاری کر رہے ہیں اور فوج کا اسلام پسند اور وطن دوست عنصر اور عراق کے تمام مسلم عوام ان کے حامی ہیں اور خطرہ ہے کہ کہیں یہ ملک میں ایک ایسے دور کی طرح نہ ڈال دیں جس میں اخوان کو اُبھرنے کا موقع مل جائے اور عراق میں جمال عبدالناصر کے خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکیں۔ چنانچہ عراق اور شام کے بعثی عناصر اور مصر و شام کی عرب یونین نے مل کر قاہرہ کے حامی انقلاب کی اسکیم تیار کی اور کرنل عبدالوہاب شواف کو جو بری اور فضائی فوج کے ایک بڑے حصہ کا مالک تھا اس اسکیم کے لیے تیار کیا۔ موصل اس اسکیم کا مرکز تھا۔ مارچ ۱۹۵۹ء کی ایک تاریک رات میں موصل میں "شواف بغاوت" کا دھماکہ ہوا۔ قاہرہ ریڈیو سے فوراً اس بغاوت کو آشیرباد ملی مگر عبدالکریم قاسم کمیونسٹوں کی مدد سے بڑی چابکدستی کے ساتھ اس بغاوت کو فرو کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ عبدالوہاب شواف گرفتار کر لیا گیا۔ عبدالکریم قاسم کمیونسٹوں کا بڑا ممنون ہوا۔ اور کمیونسٹوں کا پارہ پہلے سے بھی

زیادہ بڑھ گیا۔

عبدالوہاب شواف نے فوجی عدالت کے سامنے جو بیانات دیئے اُن میں یہ افترا پردازی کی کہ انقلاب کی تحریک ناظم طبقجلی کی طرف سے تیار کی گئی تھی۔ اور وہی دراصل اس "بغاوت" کا مرکز ہے مگر سوال یہ ہے کہ شواف کا رینک فوج میں طبقجلی کے رینک سے کم تر تھا طبقجلی جنرل تھا جب کہ شواف بریگیڈیر تھا پھر "بغاوت" کے جو احکام صادر ہوئے تھے وہ شواف کے نام سے کیسے صادر ہوئے؟ بہرحال شواف کے بیانات سے بغاوت کی تمام تر ذمہ داری طبقجلی پر آپڑی کیمونسٹ عنصر طبقجلی سے پہلے ہی شاکی تھا۔ اس لیے عبدالوہاب شواف تو بچ نکلا مگر غیظ و غضب کے "سُرخ پہاڑ" طبقجلی اور ملک کے دیندار عنصر پر ٹوٹ پڑے۔ موصل اور کرکوک میں کمیونسٹوں نے قتل و غارت اور لوٹ مار کا قیامت خیز طوفان برپا کر دیا۔

موصل اور کرکوک میں مسلمانوں کا قتلِ عام | کیمونسٹوں نے حکومت کی شہ پا کر مسلمانوں پر ہلہ بول دیا گھروں میں گھس گھس کر لوگوں کو موت کے گھاٹ اتارا۔ عمارات کو مسمار کیا۔ املاک کو تاخت و تاراج کیا۔ مسلمانوں کا قتلِ عام کیا۔ ان کی لاشوں کو ٹیلیفون اور بجلی کے کھمبوں اور درختوں پر لٹکایا۔ ان کے جسموں کی تکا بوٹی کی سروں کی کھوپڑیاں اتار پھینکیں۔ زندہ انسانوں کو رسیوں میں باندھ کر بازاروں اور سڑکوں میں گھسیٹا، اور جب وہ تاب نہ لا کر دم توڑ گئے تو ان کی لاشوں کو غلاظت کے گڑھوں میں پھینک دیا۔ زندہ انسانوں کو دفن کیا۔ ان کے پیٹ چاک کیے۔ انسانوں کو ذبح کر کے سڑکوں کے دو رویہ ستونوں پر لاشوں کو اس طرح لٹکایا جس طرح مذبح میں بھیڑ بکریوں کو کھال اتار کر لٹکایا جاتا ہے۔ مسجدوں اور مدرسوں کی بے حرمتی کی۔ اسلامی کتب خانوں کو جلایا۔ موصل کی جامع الجادر میں داخل ہو کر نمازیوں پر فائرنگ کی۔ موصل کی مشہور جامع مسجد دانیال کو اڑا دیا۔ قرآن کریم کی بے حرمتی کی اور اس کے اوراق کو پھاڑا اور انہیں پامال کیا۔ موصل کی جامع الحجیاتی کے امام کو مسجد کے مینار کے ساتھ باندھا، پھر اُسے اتار کر زندہ گلیوں میں گھسیٹا یہاں تک کہ وہ دم توڑ گیا۔ موصل کے نامور مذہبی رہنما شیخ علی العمری اور ان کی بیٹی حفصہ کو قتل کیا اور باپ بیٹی دونوں کی لاشوں کو ننگا کر کے بازاروں میں گھسیٹا، ان کی لاشوں کی تکا بوٹی کی اور ان کے مکان کو نذر آتش کر دیا۔ حد یہ ہے کہ ایک لڑکی کی دونوں ٹانگوں کو دو جیپوں کے ساتھ باندھ کر ان کو مخالف سمتوں میں پورے

زور سے چلا دیا، یہاں تک کہ اس کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ غرض مسلمان کا خون اس قدر ارزاں ہوا کہ موصل اور کرکوک کے در و دیوار لالہ زار ہو گئے۔ نہ عزت و ناموس کا احترام باقی رہا اور نہ جان و مال کا تحفظ ——— ——مذہبی رہنماؤں کو خاص طور پر نشانہ درندگی بنایا گیا اور اس میں یہ تمیز نہیں کی گئی کہ کون حکومت کا ثنا خواں تھا اور کون مخالف۔ کمیونسٹ پارٹی کے دفتروں اور مرکزوں میں لاشوں کے انبار لگ گئے۔ موصل اور کرکوک میں ۵ ہزار کے قریب انسان کمیونسٹوں کی درندگی اور بہیمیت کی بھینٹ چڑھے اور کئی روز تک یہ شہر سنسان جنگل کا منظر پیش کرتے رہے۔

کمیونسٹ پارٹی کے چھوکرے بازاروں میں میز کرسی رکھ کر "عدالت" لگا بیٹھتے تھے جس کا نام تھا "عوامی عدالت" (پیپلز کورٹ)۔ مردوں، عورتوں اور بچوں کو پکڑ پکڑ کر ان "عدالتوں" میں پیش کیا جاتا اور ایک دو سوالوں کے بعد انہیں سخت سزائیں سنا دی جاتیں۔ کسی کو تازیانے لگائے جاتے، کسی کو رسی سے باندھ کر بازاروں میں گھسیٹنے کی سزا دی جاتی اور کسی کو گولی سے اڑا کر ننگا لٹکا دیا جاتا۔ موصل کی "عدالت" کا سربراہ عبدالرحمان قصاب ایک پکا کمیونسٹ تھا۔ اس نے سینکڑوں انسانوں کو آن کی آن میں خون کے دریا میں نہلا دیا۔ عبدالکریم قاسم کا خصوصی رفیق وصفی طاہر ان ہنگاموں کی ایک ایک منٹ کی خبر معلوم کر رہا تھا۔ موصل میں عدنان جامیراد نامی ایک شخص اس خدمت پر مامور تھا کہ وہ حالات کی فوری رپورٹ وصفی طاہر تک پہنچائے۔ وصفی طاہر بار بار اس سے دریافت کرتا کہ کیا تم نے فلاں کو بازار میں گھسیٹا ہے؟ اور کیا فلاں مسجد کو مسمار کر چکے ہو؟

دیندار فوجی افسروں کو سزائے موت یہ تو موصل اور کرکوک کے شہروں کا حال تھا جو عراق میں اسلامیت کے مرکز سمجھے جاتے ہیں۔ ادھر بغداد کا حال بھی بڑا نازک تھا۔ تمام اسلام پسند افراد کو گرفتار کر لیا گیا۔ فوج کے اعلیٰ ترین عہدیدار ناظم طبقجلی اور رفعت سری "بغاوت" کے الزام میں فاضل عباس مہداوی کی "عوامی عدالت" میں پیش کیے گئے، اور انہیں وہاں سے موت کی سزا سنائی گئی جو فوراً نافذ کر دی گئی۔ سترہ اور بھی بہترین فوجی افسروں کو لپیٹ میں لے لیا گیا اور انہیں بھی پھانسی کے تختہ پر لٹکا دیا گیا۔ بغداد کے اسلامی مکتبوں اور مدرسوں پر بھی دست درازیاں کی گئیں۔ مشہور اسلامی رہنما شیخ محمد محمود صواف کے اخبار "لواء الاخوة الاسلامیة" کے دفتر اور پریس کو جلا دیا گیا۔ خود شیخ صواف کا تعاقب

بھی کیا گیا۔ مگر موصوف چھپ چھپا کر شام چلے گئے۔ علمائے دین اور مذہب پسندوں کے لیے یہ حادثہ شورِ محشر سے کم نہ تھا۔ بڑے بڑے لوگ ملک سے ہجرت کر کے شام اور اردن کی طرف نکل کھڑے ہوئے، حتیٰ کہ عراق کے مشہور ترین سن رسیدہ عالم شیخ امجد الزھاوی تک کو، جو ترکی حکومت کے زمانہ میں عراق کے قاضی القضاۃ رہ چکے ہیں، بھاگ کر مدینہ منورہ میں پناہ لینی پڑی[1]۔

عوام کا ردِ عمل اور کمیونسٹوں کا زوال موصل اور کرکوک کے قتل عام سے پورے ملک میں سراسیمگی چھا گئی۔ کمیونسٹوں کی جرأت اور حکومت کی کمیونسٹ نوازی پر ہر شخص انگشت بدنداں تھا۔ ملک کا مستقبل ہولناک تیرگی کے منہ میں تھا۔ کمیونزم کا اژدھا اس طرح پھنکار رہا تھا کہ دین اور اہلِ دین دم بخود تھے۔ بغداد میں فاضل عباس مہداوی اور موصل میں عبدالرحمان قصاب کی "عدالتیں" اسپین کی "تحقیقاتی عدالتوں" کی طرح انسانی مذابح میں تبدیل ہو چکی تھیں۔ جب ناظم طبقلی اور رفعت سرّی اور دوسرے سترہ فوجی افسروں کو پھانسی پر لٹکایا گیا تو ملک کا پیمانۂ صبر یکلخت چھلک گیا۔ کمیونسٹوں کے خلاف ملک بھر میں شدید غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ احتجاجی مظاہرے شروع ہو گئے۔ حکومت نے کمیونسٹوں کی مدد سے ان مظاہروں کو گولی کی طاقت سے دبانا چاہا۔ مذہبی اور ملی رہنماؤں پر ان مظاہروں کو بھڑکانے کا الزام لگایا۔ مگر حکومت کی یہ تدبیر کارگر نہ ہوئی۔ عوام الناس عبدالکریم قاسم کی حکومت کے خلاف یکایک اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

کمیونسٹوں نے عبدالکریم قاسم کا ساتھ اس لیے دیا تھا کہ ان کے مقاصد کے لیے جمہوریت کی بہ نسبت ڈکٹیٹر زیادہ موزوں ہوتا ہے۔ اور وہ سمجھتے ہیں کہ ڈکٹیٹر کے زیر سایہ رہ کر اگر وہ ملک کے دروبست پر ایک دفعہ چھا جائیں تو ملک پر قبضہ کرنے کے لیے بس ایک آدمی کو ہٹا دینے کا مسئلہ باقی رہ جاتا ہے جسے حل کرنا کچھ مشکل نہیں ہوتا۔ مگر کبھی کبھی معاملہ برعکس بھی ہو جاتا ہے۔ ڈکٹیٹر کسی کا دوست نہیں ہوتا، نہ اسے کسی نظریے سے دلچسپی ہوتی ہے۔ اسے تو صرف اپنے اقتدار سے دلچسپی ہوتی ہے اور اس کے لیے وہ آج ایک شخص کا دوست ہوتا ہے، تو کل اسی کا دشمن ہو

[1] مقام ہی یہ پوری داستان اسی زمانہ میں عراق سے نکلنے والے ادیبوں، صحافیوں اور علماء نے اخبارات و رسائل میں بھی اور پمفلٹوں کی شکل میں بھی شائع کر دی تھی جس میں واقعات کے فوٹو بھی موجود تھے۔ اس زمانے میں شام اور اردن کے شہر عراق کے پناہ گزینوں سے بھرے ہوئے تھے اور وہ خود اپنے اوپر گزرے ہوئے اور آنکھوں دیکھے ظلم و ستم کی ایسی ایسی داستانیں سناتے تھے جن سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔

جاتا ہے۔ عبدالکریم قاسم نے یہ دیکھ کر کہ پوری فضا اس کی دشمن ہو گئی ہے اور کمیونسٹوں کی حمایت میں آ سے لینے کے دینے پڑ رہے ہیں، یکایک اپنی پالیسی تبدیل کر دی اور کمیونسٹوں کی مخالفت شروع کر دی۔ اس نے یکے بعد دیگرے ایسے بیانات دیے جن میں موصل اور کرکوک کے ہنگاموں کی ذمہ داری کمیونسٹ پارٹی پر عائد کی۔ کمیونسٹوں پر شدید طعن و تشنیع کی، انہیں چنگیز خاں اور ہلاکو سے تشبیہ دی۔ بغداد کے جلاد فاضل عباس مہداوی کو ملک سے رخصت کیا۔ موصل کا جلاد عبدالرحمن قصاب روپوش ہو کر ماسکو فرار ہو گیا۔ اب عتاب کا رُخ تمام تر کمیونسٹوں کی طرف تھا۔ موصل اور کرکوک میں کمیونسٹ ڈرے ہوئے کتوں کی طرح ہر اوٹ کی پناہ ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔ فطرت کی تعزیریں انہیں کیے کا مزہ چکھا رہی تھیں۔ ۲۱۳ بڑے بڑے کمیونسٹ لیڈر مارے گئے۔ اکثر و بیشتر نے موصل اور کرکوک سے بھاگ کر بغداد میں جا کر پناہ لی، اور سابق سرپرست کی حمایت چاہی۔ مگر کہیں ان کو پناہ نہیں مل سکی۔ عبدالکریم قاسم نے اب کمیونزم سے "تائب" ہو کر قوم پرستوں اور بعثیوں سے ملی بھگت کر لی۔ نئی وزارت میں تمام وزراء قوم پرست اور بعثی لیے گئے اور اسلامی عناصر کے ساتھ صرف اس حد تک اس نے تعاون کیا کہ ان کی بعض تقریبوں میں شمولیت کی اور میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جلسوں کا افتتاح کر دیا۔

فروری ۱۹۶۰ء سے ملک میں سیاسی چہل پہل بھی شروع ہو گئی۔ کئی نئے سرکاری اخبارات جاری ہوئے۔ مثلاً الشّورہ، الاھالی، المبدٔاء۔ ان اخبارات نے کمیونسٹوں کی ریشہ دوانیوں، سازشوں، غداریوں، وطن فروشانہ اسکیموں اور ستم رانیوں کو خوب خوب بے نقاب کرنا شروع کر دیا۔ حکومت کی طرف سے جماعت سازی کی اجازت کا قانون صادر ہوا۔ اس اجازت سے فائدہ اٹھا کر متعدد سیاسی پارٹیاں قائم ہوئیں۔ ان میں سے ایک نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی تھی جو قوم پرست اور بعثی عناصر کی نمایندگی کرتی تھی۔ دوسری کُرد پارٹی جو عراق کے اندر علیحدہ کُرد اسٹیٹ کے قیام کی حامی تھی۔ تیسری کمیونسٹ پارٹی جو اُن کمیونسٹ لیڈروں نے قائم کی تھی جو اصل کمیونسٹ پارٹی سے الگ ہو گئے تھے اور ان ہنگاموں سے برأت کا اظہار کر رہے تھے جن کی تفصیل اوپر گزر چکی ہے۔ اصل کمیونسٹ پارٹی پھر زیرِ زمین چلی گئی۔ عراق کے اسلام پسند عناصر نے بھی ایک پارٹی کی تاسیس کی جس کا نام "الحزب الاسلامی" رکھا گیا۔ اس کا باقاعدہ ملک گیر انتخاب ہوا، لائحہ عمل اور دستور مرتب کیا گیا اور جب اجازت حاصل کرنے کے لیے حکومت کو درخواست دی گئی تو حکومت نے مختلف بہانہ تراشیوں سے اُس کی درخواست نامنظور کر دی۔ حکومت کے اس فیصلے کو بغداد ہائی کورٹ

میں چیلنج کیا گیا۔ عدالت نے حکومت کے فیصلے کو خلافِ قانون قرار دے کر کالعدم کر دیا اور پارٹی طمطراق کے ساتھ میدان عمل میں اتر آئی۔ الحزب الاسلامی نے تین اخبارات جاری کیے۔ الحیاد، الفیحاء، الجہاد۔ مگر حکومت کی طرف سے ان اخبارات پر طرح طرح کی پابندیاں عائد ہوتی رہیں اور وہ یکے بعد دیگرے بند ہوتے گئے۔ مجموعی طور پر بعث پارٹی ملک میں غالب اثر کی مالک ہو گئی۔

قاسم اور کیمونسٹوں میں دوبارہ اتحاد عبدالکریم قاسم اور کیمونسٹ عناصر کے درمیان مخالفت کا وقفہ بہت محدود رہا۔ عبدالکریم قاسم کو عوام کی نگاہ میں گرتا دیکھ کر عراق کی بعث پارٹی نے اس کو قتل کر کے ملک پر اپنا اقتدار قائم کرنے کی اسکیم تیار کی۔ عبدالکریم قاسم پر بغداد کے ایک چوک میں ناکام حملہ بھی ہوا۔ اور اُسے اسپتال داخل ہونا پڑا۔ اس کے بعد سرخوں کی پھر بن آئی اور انہوں نے عبدالکریم قاسم سے مصالحت کر لی۔ عبدالکریم قاسم بعثی، قومی اور دطنی عناصر کے خلاف ہو گیا اور کیمونسٹوں کو ہی اپنا اصل محافظ سمجھنے لگا۔ اس مصالحت کے بعد ملک کے اندر پہلی حالت پھر عود کر آئی۔ اور کیمونسٹوں کو پھر غلبہ حاصل ہو گیا۔ اس مرتبہ انہوں نے سطحی اور انتقامی جوش و خروش کے بجائے ملک کے اندر بنیادی تبدیلیوں کا راستہ اختیار کیا حتیٰ کہ شرعی قوانین تک میں تبدیلیاں شروع کر دیں جن سے ملک میں سخت نفرت کا اظہار کیا گیا۔ دوسری طرف معاشی تبدیلیوں سے عراق کی برطانوی تیل کمپنی نے بھی جو اب تک کیمونسٹوں کی سرگرمیوں پر خاموش تھی، تشویش کا اظہار شروع کر دیا۔ عوام کو یہ اندیشہ لاحق ہوا کہ کیمونسٹوں کے برسرِ اقتدار آجانے سے کہیں پھر پچھلے مظالم کا اعادہ نہ ہو۔ اور فوج میں بھی طاقت ور عناصر عبدالکریم قاسم کے دشمن ہو گئے کیونکہ ان کے بڑے بڑے لیڈروں کو بے دردی کے ساتھ قتل کر دیا گیا تھا۔ آخر کار عبدالسلام عارف اور بعض دوسرے فوجی افسروں نے انقلاب برپا کر کے عبدالکریم قاسم ہی کا نہیں، اس کی زندگی کا بھی خاتمہ کر دیا۔ یوں ۱۹۶۳ء میں عراق نے ایک نئے دور کا آغاز کیا۔

(باقی)

رسائل و مسائل

اوّلین مذہب انسان کا شرک تھا یا توحید

سوال - اسلام نے تاریخِ مذاہب کا یہ تصور جو پیش کیا ہے کہ نوعِ انسانی کا آغاز علم کی روشنی میں ہوا ہے، اور نوعِ انسانی کا ابتدائی دین توحید تھا، اور شرک اس کے بعد آیا، یہ ایک مفروضہ (ASSUMPTION) ہے - اس کو ثابت کیسے کیا جائے؟

جواب - یہ بات کہ زمین پر انسان کی زندگی کی ابتدا علم کی روشنی میں ہوئی ہے، اور آدم علیہ السلام اور اس کے بعد متصل دور کی انسانی نسل کا دین توحید پر مبنی تھا، ایک مفروضہ نہیں ہے بلکہ علمِ وحی کی دی ہوئی خبر ہے - اور ہم کو وحی کے ذریعہ سے علم کی ضرورت پیش ہی اس جگہ آتی ہے جہاں انسانی ذرائع معلومات ہمیں کام نہیں دیتے - نوعِ انسانی کے ابتدائی دین کو جاننے کا کوئی ذریعہ درحقیقت ہمارے پاس نہیں ہے، کیونکہ یہ معاملہ اس دور سے تعلق رکھتا ہے جس کی کوئی تاریخ دنیا میں موجود نہیں ہے، نہ اس تاریخ کو جاننے کے ذرائع موجود ہیں - موجودہ زمانے کے لوگ اس معاملے میں علم الآثار (ARCHAEOLOGY) اور علم الانسان (ANTHROPOLOGY) پر اعتماد کرتے ہیں - مگر یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ یہ علوم ہم کو ابتدائی انسانی زندگی کے ہر پہلو کے متعلق مکمل معلومات دیتے ہیں - یہ قیاسی علوم ہیں اور ظاہر ہے کہ قیاس سے جو آراء قائم کی جاتی ہیں وہ "علم" کی تعریف میں نہیں آتیں - جو قدیم باشندے (ABORIGINES) اس وقت دنیا میں پائے جاتے ہیں ان کے متعلق علم الانسان کے ماہرین نے یہ فرض کر لیا ہے کہ وہ آج ٹھیک اسی حالت میں ہیں جس میں ابتدائی انسان تھا - لیکن درحقیقت کسی علمی بنیاد پر یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ وہ بعینہٖ اسی ذہنی، اخلاقی اور معاشرتی حالت پر قائم ہیں جو ہزارہا سال پہلے ابتدائی انسانوں کی حالت تھی - اس لیے مجرّد ان ذرائع علم کے اعتماد پر نہ یہ فیصلہ

کیا جاسکتا ہے کہ آغاز میں انسان کا مذہب شرک تھا اور نہ یہ کہ وہ توحید پر مبنی تھا۔ ایسے ہی مواقع پر یہ ضرورت پیش آتی ہے کہ وحی کے ذریعہ سے حقیقت اور امر واقعی کا علم ہم کو براہِ راست دیا جائے، اور یہی وہ علم ہے جو قرآن نے ہم کو دیا ہے۔

جنوں سے قرآن کا خطاب کس حیثیت سے ہے؟

سوال:۔ اگر جنوں کو خلافت نہیں دی گئی، اور اس کے باوجود انہیں قرآن پر ایمان لانے کی دعوت دی گئی ہے، تو وہ قرآن سے فائدہ کیسے اٹھا سکتے ہیں؟ قرآن تو انسان کی خلافتی حیثیت (ASPECT) ہی سے بحث کرتا ہے۔ پھر جنوں کا قرآن پر ایمان لانا اور عمل کرنا کس نوعیت کا ہے؟

جواب۔ یہ خیال کرنا صحیح نہیں ہے کہ قرآن صرف انسانوں کی خلافتی حیثیت ہی سے بحث کرتا ہے۔ دراصل قرآن اولاً یہ بتاتا ہے کہ جس مخلوق کو عقل و تمیز دے کر کفر و ایمان، دونوں چیزوں کا اختیار عطا کر دیا گیا ہے اسے اپنے اختیار کا غلط استعمال کر کے کفر کی راہ اختیار نہیں کرنی چاہیے بلکہ خود اپنی مرضی سے بندگی کی راہ اختیار کرنی چاہیے۔ اور پھر وہ اسے تعلیم دیتا ہے کہ بندہ بن کر رہنے کے لیے اس کا طرزِ فکر و طرزِ عمل کیا ہو۔ ثانیاً وہ اس ذی عقل مخلوق کو جسے خلافت بھی دی گئی ہے، اس کے فرائض سے آگاہ کرتا ہے اور اس طرزِ عمل سے منع کرتا ہے جو اس کے مقامِ خلافت کے منافی ہے۔ جنوں کا تعلق اس تعلیم کے صرف پہلے حصّے سے ہے، اور انسانوں کا تعلق دونوں حصّوں سے۔

وحی اور کشف کا فرق

سوال۔ میں وحی، یعنی وارداتِ نبوت (PROPHETIC EXPERIENCE) اور کشف یعنی وارداتِ تصوف (MYSTIC EXPERIENCE) کا فرق ذرا وضاحت کے ساتھ سمجھنا چاہتا

ہوں۔ سینٹ پال اپنے مکاشفے کے بل پر جو کچھ کرتا رہا ہے، اسے عیسائی وحی (REVELATION) سمجھتے ہیں۔ ہمارا موقف اس بارے میں کیا ہونا چاہیے۔

جواب ۔ واردات نبوت اور صوفیانہ واردات دونوں اصطلاحیں ان لوگوں کی ایجاد کردہ ہیں جو مذہب کے اسلامی تصور سے نا آشنا ہیں اور جنہوں نے اپنی آزاد فلسفیانہ فکر سے کام لے کر اس عالم میں بادیہ پیمائی کی کوشش کی ہے جس کا درحقیقت انہیں کوئی تجربہ نہیں ہے۔ موجودہ زمانے کے مسلم مفکرین نے انہی کی اصطلاحات کو اختیار کر کے بات سمجھانے کی کوشش کی ہے، مگر اس سے بات اور الجھ گئی ہے۔ کیونکہ ہر اصطلاح کا ایک خاص فکری پس منظر ہوتا ہے اور جب آپ وہ اصطلاح استعمال کریں گے تو اس کو اس کے فکری پس منظر سے الگ نہ کر سکیں گے، بلکہ بسا اوقات اس اصطلاح کے ساتھ اس کا فکری پس منظر خود آپ کے ذہن پر مسلط ہو جائے گا۔ اسلام حقیقت کو بالکل صاف اور واضح شکل میں بیان کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نبی پر وحی نازل کر کے اسے براہ راست صاف اور صریح شکل میں وہ علم دیتا ہے جو انسان کو حقیقت سے آگاہ کرنے اور اس کی رہنمائی کرنے کے لیے درکار ہے۔ اس علم میں کوئی اشتباہ یا التباس نہیں ہوتا۔ وہ صحیح معنوں میں "علم" ہوتا ہے۔ بخلاف اس کے نبی کے ماسوا دوسرے انسانوں کو الہام، القاء یا کشف کی صورت میں جو ہدایات یا معلومات ملتی ہیں ان میں اول تو تعلیم بالکل واضح اور صریح نہیں ہوتی، دوسرے انسان کو قطعی طور پر یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ یہ ایک "علم" ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو دیا جا رہا ہے، تیسرے اس میں اس امر کا بھی امکان ہوتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آیا ہوا "علم" نہ ہو بلکہ کوئی دوسری طاقت آدمی کی غلط رہنمائی کر رہی ہو، یا کم از کم یہ کہ اس میں جو دھندلی رہنمائی اللہ تعالیٰ کی طرف سے کی گئی ہو اسے آدمی ٹھیک نہ سمجھے اور اس کے ساتھ خود اس کے اپنے خیالات اور شیطانی وساوس خلط ملط ہو جائیں۔ اس وجہ سے علمائے اسلام نے یہ کہا ہے کہ الہام و القاء کے ذریعہ سے جو رہنمائی ملے اسے لازماً نبی کے ذریعے سے آئی ہوئی رہنمائی سے مقابلہ کر کے دیکھ لینا چاہیے۔ اگر وہ اس سے مطابقت رکھتی ہو تو صحیح ہے، اور اگر اس سے مختلف ہو تو غلط ہے۔ یہ ہے اس معاملے میں صاف اور صریح بات جسے خواہ مخواہ "وارداتِ نبوت" اور "وارداتِ تصوف" کی اصطلاحیں

استعمال کر کے گنجلک بنا دیا گیا ہے۔

سینٹ پال کے بارے میں مختصراً صرف اتنا کہنا کافی سمجھتا ہوں کہ آپ انجیلوں میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تقریروں اور ارشادات کا گہرا مطالعہ کریں، اور پھر ان کا مقابلہ سینٹ پال کی تحریروں سے کر کے دیکھیں۔ جہاں جہاں اس کی تحریریں صریح طور پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ان تعلیمات سے جو خود انجیل میں موجود ہیں، متصادم ہو رہی ہوں، وہاں لازماً یہ ماننا پڑے گا کہ سینٹ پال حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات سے منحرف ہو گیا ہے۔ اب یہ کام عیسائیوں کا اپنا ہے کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو صحیح مانیں یا سینٹ پال کو۔ نیز اس فرق کے واضح ہو جانے کے بعد عیسائیوں ہی کو یہ فیصلہ بھی کرنا چاہیے کہ جو باتیں سینٹ پال کی تعلیم میں ہیں اور حضرت عیسیٰ کی تعلیم میں نہیں ہیں، ان پر وہ کہاں تک اعتماد کریں۔ عقل یہ کہتی ہے کہ جس شخص کی تعلیمات متعدد امور میں حضرت عیسیٰ کی تعلیمات کے خلاف ہیں، اس کے کیے ہوئے اضافے دین میں قابلِ اعتماد نہیں ہونے چاہییں۔

مطبوعات

ساتھی کے نام | تالیف جناب اسعد گیلانی صاحب۔ شائع کردہ: ادارہ ادبِ اسلامی، سرگودھا۔ قیمت تین روپے۔ صفحات ۱۶۳۔

اس کتاب کے فاضل مصنّف جناب اسعد گیلانی صاحب ایک صاحبِ دل ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ اقامتِ دین کی جدوجہد میں عملاً بھی کئی سال سے شریک چلے آرہے ہیں۔ یہ خطوط انہوں نے اپنے رفقاءِ سفر کو اُن کی مختلف مقامات اور منازل پر رہنمائی کے لیے لکھے ہیں۔ ان خطوط میں ادبیت کی چاشنی کے ساتھ ساتھ عملی دشواریوں کا کامیابی سے مقابلہ کرنے کا داعیہ بھی پایا جاتا ہے۔

سیرت الاخوین | تالیف: جناب خالد گرجاکھی۔ شائع کردہ مکتبۂ نور گرجاکھ، ضلع گوجرانوالہ۔ قیمت فی جلد ۵ روپے۔ ملنے کا پتہ: سکول بک ڈپو گوجرانوالہ۔

یہ کتاب دو حصّوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصّے میں حضرت عثمان ذوالنورین اور دوسرے حصّے میں حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی سیرت بیان کی گئی ہے۔ اس کتاب کی تصنیف میں مصنّف نے اس بات کی صراحت کی ہے کہ ملّت کی ان دو بزرگ و برتر ہستیوں کے مابین نزاع کا جو تصوّر قائم ہوگیا ہے وہ بالکل غلط ہے۔ حضور سرورِ کائنات کے یہ دو جلیل القدر صحابی اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ کی تصویر تھے۔

اسلام کا نظامِ محاصل ترجمہ: کتاب الخراج | تالیف: قاضی ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ۔ ترجمہ: جناب محمد نجات اللہ صدیقی۔ ناشر: مکتبہ چراغ راہ، کراچی۔ سول ایجنٹ: اسلامک پبلی کیشنز لمیٹڈ۔ ۱۳۔ ای شاہ عالم مارکیٹ لاہور

قیمت اعلیٰ ایڈیشن ۵۰، ۱۲ روپے۔ سستا ایڈیشن: ۸ روپے۔ صفحات: ۶۳۵

قاضی ابو یوسف علیہ الرحمۃ کی مشہور تصنیف کتاب الخراج دینی احکام کا ایک نہایت قیمتی خزانہ ہے۔ اس بنا پر اس کتاب کو اسلامی ادب میں ہمیشہ ایک اساسی حیثیت حاصل رہی ہے۔ اس کتاب میں اسلامی نظامِ معیشت کے صرف اصول ہی بیان نہیں کیے گئے بلکہ خلفائے راشدین کے مبارک عہد کے واقعات سے استشہاد کیا گیا ہے۔ معیشت کے علاوہ اس میں اسلام کے سیاسی احکام کی بھی وضاحت کی گئی ہے۔ درحقیقت یہ قابلِ قدر تصنیف اسلامی نظامِ حیات کے اجتماعی نقوش کو بڑی عمدگی سے اُبھارتی ہے۔

مکتبہ چراغِ راہ نے اسلامی تعلیمات کے اس بیش قیمت مجموعے کو اردو میں منتقل کروا کر علم اور خصوصاً علم دین کی بہت بڑی خدمت کی ہے۔ اس کتاب کی غیر معمولی اہمیت اور اس کے مباحث کی گہرائی اس بات کی متقاضی تھی کہ کوئی ایسا صاحبِ علم اسے اردو کے قالب میں ڈھالے جو نہ صرف عربی زبان سے اچھی طرح واقف ہو بلکہ دینی علوم اور علومِ جدیدہ کے بارے میں بھی بڑی ٹھوس معلومات رکھتا ہو۔ چنانچہ اس فرض کی انجام دہی کے لیے علی گڑھ یونیورسٹی کے شعبۂ معاشیات کے رُکن جناب نجات اللہ صدیقی صاحب کا انتخاب کیا گیا۔ فاضل مترجم نے اس کام کو جس دیدہ وری اور محنت سے پایۂ تکمیل تک پہنچایا ہے وہ ہر لحاظ سے قابلِ ستائش ہے۔ آغاز میں انہوں نے سو صفحات کا ایک مبسوط مقدمہ لکھا ہے اور آخر میں ایک جامع اشاریہ مضامین بھی شامل ہے۔ ہمیں امید ہے کہ یہ کتاب سارے علمی حلقوں سے خراجِ تحسین حاصل کرے گی۔

کتاب کا معیارِ طباعت اور کتابت عمدہ ہے۔

ISLAM IN THEORY AND PRACTICE

تالیف: محترمہ مریم جمیلہ۔ شائع کردہ: محمد یوسف خاں، سنت نگر لاہور۔ ملنے کا پتہ: مکتبۂ یوسفیہ ۲۲ ایلیمن سٹریٹ، ہال روڈ، لاہور۔ صفحات ۲۹۴۔ قیمت دس روپے۔

محترمہ مریم جمیلہ کی یہ فاضلانہ تصنیف "اسلام نظریہ اور عمل میں" تین حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں انہوں نے بڑے دلچسپ انداز میں اُن محرکات کا ذکر فرمایا ہے جن کی وجہ سے انہوں نے اپنے آبائی

مذہب کو خیر باد کہہ کر اسلام کو قبول کیا۔ پھر انہوں نے اسلامی اقدار کی روشنی میں مغربی الحاد اور لادینیت پر ایک بھرپور تنقید کی ہے اور اس کے بعد یہ بتایا ہے کہ مستشرقین اسلام کا کس طرح جان بوجھ کر نہایت غلط تصور پیش کرتے ہیں۔

دوسرے حصے میں انہوں نے اسلامی تعلیمات پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ یُوں تو یہ ساری بحث بڑی اچھی ہے لیکن انہوں نے مسلمان عورت کے دائرہ کار پر جو خیالات پیش کئے ہیں اُن سے اُن کے اسلام کے بارے میں صحیح نقطۂ نگاہ کی پوری طرح ترجمانی ہوتی ہے۔

تیسرے حصے میں انہوں نے مختلف تحریکات اور دورِ جدید میں امت کے نامور مُصلحین کے افکار کی نہایت جچے تُلے انداز میں وضاحت کی ہے اور جہاں جہاں انہوں نے کوئی غلطی محسوس کی ہے وہاں اس کی نشاندہی بھی کردی ہے۔ اس حصے کے چند عنوانات یہ ہیں:۔ محمد بن عبدالوہابؒ کی تحریک، سنوسی تحریک شاہ ولی اللہ، سید احمد شہیدؒ، پرنس حلیم پاشاؒ، جمال الدین افغانیؒ، سید رشید رضاؒ اور ان کی تحریک، شیخ حسن البناؒ اور الاخوان المسلمون، مولانا محمد علی جوہرؒ، علامہ اقبالؒ اور اُن کا پیغام، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اور جماعتِ اسلامی۔

یہ کتاب معلومات کے لحاظ سے قابلِ قدر ہے۔ خصوصاً ایک غیر مسلم کے لئے اس کا مطالعہ بڑا مفید ثابت ہوسکتا ہے مگر اس کتاب کا ہمارے نزدیک سب سے روشن پہلو مُصنّفہ کا اسلام کے متعلق صحیح تصور اور مغربی تہذیب اور اس کے نظریات اور عملی مظاہر کے بارے میں صحیح ردِعمل ہے۔ اِس دَور میں جبکہ بعض بڑے بڑے اہلِ علم غالب تہذیب کے رُجحانات سے متاثر اور مرعُوب ہو رہے ہیں۔ اس مادّی تہذیب کی آغوش میں جنم لینے والی اور پرورش پانے والی کسی خاتون کا دین کے مزاج کو صحیح طور پر سمجھ کر اُسے اپنانے کے لئے بھرپور کوشش کرنا اور مغرب کی ذہنی غلامی میں گرفتار لوگوں کو آزادی کی دعوت دینا، حیرت انگیز کارنامہ ہے۔

فاضل مُصنّفہ کی زبان بڑی سلیس اور رواں ہے اور وہ اپنی بات کو سلیقے کے ساتھ کہنے کی نہایت اچھی استعداد رکھتی ہیں۔ معیارِ طباعت عمدہ ہے۔ پروفوں کے پڑھنے میں البتہ پُوری احتیاط سے کام

نہیں لیا گیا جس کی وجہ سے آخر میں طویل غلط نامہ لگانا پڑا ہے۔

البلاغ (ماہنامہ) زیر سرپرستی جناب مفتی محمد شفیع صاحب۔ مدیر اعلیٰ محمد تقی عثمانی صاحب۔ ڈاک کا پتہ۔ البلاغ، دارالعلوم کراچی نمبر ۱۴۔ سالانہ چندہ چھ روپے فی پرچہ ۵۶ پیسے۔

یہ قابلِ قدر ماہنامہ مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کی نگرانی میں کئی ماہ سے شائع ہو رہا ہے۔ اور موصوف کی علمی ثقاہت کا ہر طرح آئینہ دار ہے۔ اِس دَور میں جب مغربی افکار ہر طرف سے مسلم معاشرے پر یلغار کر رہے ہیں، دین کے دفاع کے لیے جو بھی کوشش کی جائے وہ لائقِ ستائش ہے۔ خصوصاً جب یہ کوشش ایک ایسی صاحبِ علم شخصیت کی نگرانی میں ہو جن کے تفقُّہ فی الدّین پر پُورا بھروسہ کیا جاسکتا ہے۔

ہندوستان میں یہ مجلہ مولانا ظہور الحق صاحب خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون ضلع مظفر نگر (یو۔پی) کو مبلغ چھ روپے سالانہ چندہ بھیج کر جاری کروایا جاسکتا ہے۔

تحریکِ آزادیِ فکر، اور حضرت شاہ ولی اللہ کی تجدیدی مساعی تالیف: شیخ الحدیث مولانا محمد اسماعیل صاحب سلفی گوجرانوالہ۔ طابع: مکتبہ نذیریہ، قصور۔ ملنے کا پتہ: مکتبہ نعمانیہ، اُردو بازار، گوجرانوالہ۔ صفحات ۲۴۴۔ قیمت مجلد ۸ روپے۔

اس کتاب کے مصنف علمی حلقوں میں محتاجِ تعارف نہیں۔ اس کتاب میں انہوں نے سب سے پہلے مسلکِ اہلِ حدیث کی تصریح فرمائی ہے اور بتایا ہے کہ شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے کس طرح جمود کو توڑ کر اجتہاد کے لیے راہ ہموار کی۔ شاہ صاحبؒ اُس دَور کے اہلِ حدیث اور اہل الرائے دونوں کے طرزِ عمل سے ناخوش تھے۔ ان کی رائے میں مسلک اہلِ حدیث محض ایک رسم بن کر رہ گیا تھا۔ ائمہ کے پیروؤں میں استدلال اور استنباط کی بجائے تقلید اور جمود پیدا ہو چکا تھا۔ "شاہ صاحب چاہتے تھے کہ دونوں گروہ حقیقت پسندی سے کام لیں اور اہل الرائے اکابر کی بجائے کتاب و سنت کو اساس قرار دیں اور اہلِ حدیث ظاہریت سے بچ کر تفقہ سے کام لیں۔" ص۴۹

کتاب کے ایک باب میں فاضل مصنف نے تحریک اہلِ حدیث کے تاریخی موقف اور اس کی خدمات کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ پھر انہوں نے مسئلہ تقلید پر بھی اپنے خیالات کا اظہار فرمایا ہے اور اس ضمن میں بعض فقہی مسائل کی توضیح بھی کی ہے۔

جس موضوع پر مولانا نے قلم اٹھایا ہے وہ بڑا نازک ہے اور اس میں اختلاف کی گنجائش موجود ہے۔ انہوں نے اس ساری بحث میں اپنے علمی وقار کو سامنے رکھتے ہوتے سنجیدگی سے اظہار خیال کیا ہے اور اپنے موقف کی تائید میں دلائل پیش کیے ہیں۔ البتہ ایک باب یعنی اہل حدیث کی اقتدا میں اُن کا انداز بیان کہیں کہیں تلخ ہو گیا ہے۔ کتاب کی قیمت کچھ زیادہ معلوم ہوتی ہے۔

تحریکِ اسلامی ایک نظر میں | تالیف: جناب اسعد گیلانی صاحب۔ شائع کردہ: ادارہ فرینڈز پبلی کیشنز، ملتان۔ صفحات ۱۹۲۔ قیمت ایک روپیہ نوے پیسے۔

جناب اسعد گیلانی صاحب رکن مرکزی مجلسِ شوریٰ جماعت اسلامی پاکستان علمی اور دینی حلقوں میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ انہوں نے اسلام اور تحریکِ اسلامی پر متعدد کتابیں بڑے عام فہم انداز میں تحریر فرمائی ہیں۔ زیرِ تبصرہ کتاب بھی اسی سلسلہ کی ایک کامیاب کوشش ہے۔ موجودہ دور میں تحریکِ اسلامی کے داعی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے تحریک کے مقاصد اور اس کے مختلف گوشوں کی وضاحت جس شرح و بسط سے کی ہے وہ کئی ہزار صفحات میں پھیلی ہوئی ہے۔ اس بات کی عرصہ سے ضرورت محسوس کی جا رہی تھی کہ ان بیش قیمت تصریحات کی تلخیص شائع کی جائے تاکہ اس تحریک سے متاثر ہونے والا شخص ابتدا ہی میں کم سے کم وقت میں اس سے اچھی طرح متعارف ہو سکے۔ اس ضرورت کو تحریک کے ایک مخلص اور ذہین کارکن اور اسلامی ادب کے معروف صاحبِ قلم نے جس خوبی سے پُورا کیا ہے وہ لائق ستائش ہے۔ اس کے مطالعہ سے آدمی تحریکِ اسلامی کے مزاج، مقصد اور منہاج سے اچھی طرح متعارف ہو جاتا ہے۔

تنویر معاشرہ | تالیف: جناب عبدالرشید حنیف صاحب۔ ناشر: مکتبہ تنویر ادب ٹوبہ ٹیک سنگھ

صفحات ۷۲ ۔ قیمت اعلیٰ ایڈیشن ایک روپیہ پچاس پیسے ۔ سستا ایڈیشن ایک روپیہ ۔

اس مختصر سی کتاب میں معاشرتی زندگی کو اسلامی تعلیمات کے نُور سے منوّر کرنے کے لئے نہایت اچھی معلومات فراہم کی گئی ہیں ۔ فاضل مصنّف نے قرآن و سنت کے ان جواہر ریزوں کو جس سلیقے سے یکجا کیا ہے وہ ان کے دینی ذوق کا ترجمان ہے۔ اس کتابچے میں انہوں نے اکرامِ والدین، ہمسایہ سے حسنِ سلوک ، اخلاق حسنہ ، ضبطِ نفس ، حفظِ لسان ، امر بالمعروف اور علماء ، خوفِ خدا ، کے متعلق اسلامی احکام کو بیان کیا ہے ۔

حمید نظامی | جناب شورش کاشمیری صاحب ۔ ناشر مطبوعاتِ چٹان لمیٹڈ ، لاہور ۔ قیمت دو روپے ۲۵ پیسے ۔ صفحات ۱۱۲ ۔

جناب شورش کاشمیری کے اندازِ سوانح نگاری کے متعلق اکتوبر ۱۹۶۷ء کے ترجمان القرآن میں عرض کیا جا چکا ہے ۔ زیرِ تبصرہ کتاب اسی منفرد انداز کی ترجمانی کرتی ہے ۔ اس میں انہوں نے حمید نظامی مرحوم کا ایک سیاسی مبصر، ایک مشہور اخبار نویس کی حیثیت سے جائزہ لینے کی بجائے ، ایک اہلِ دل انسان کی حیثیت سے ان کی زندگی کا خاکہ پیش کیا ہے ۔ اس خاکے میں فاضل مصنّف کی مرحوم سے گہری محبت کا اظہار تو ہوتا ہی ہے مگر یہ بات بھی کھل کر سامنے آتی ہے کہ اس محبت نے کبھی اندھی عقیدت کی صورت اختیار نہ کی اور جناب شورش اُن کی خوبیوں کے پوری طرح معترف ہونے کے باوجود بعض معاملات میں ان کے نقطۂ نظر یا طرزِ فکر سے اختلاف رکھتے رہے ۔ اس اختلاف کے ہوتے ہوتے دونوں میں غیر معمولی قربت اور ایک دوسرے سے نہایت گہرا تعلق اُس وضعداری کا آئینہ دار ہے جو بدقسمتی سے آج بڑی سرعت کے ساتھ ختم ہو رہی ہے ۔

میاں افتخار الدین | جناب شورش صاحب کی کتاب "میاں افتخار الدین" میں بھی ہمیں سوانح نگاری کا یہی انداز نظر آتا ہے ۔ اس کتاب کا معیارِ طباعت و کتابت مطبوعاتِ چٹان لمیٹڈ کے معیار کے عین مطابق ہے ۔ اس کی قیمت ڈیڑھ روپیہ ہے ۔

ترجمان القرآن | مترجم : جناب عبید الحق صاحب ۔ طابع و ناشر : المکتبۃ العلمیہ ۔ ۱۵ ایک روڈ ، لاہور ۔

مولانا عبدالحق مرحوم و مغفور نے قرآن مجید کے ترجمے سے لوگوں کو روشناس کرانے کے لیے جو قابلِ قدر سلسلہ شروع کیا تھا اُن کے لائق فرزند نے اُسے برابر جاری رکھا ہے۔ زیرِ تبصرہ حصّہ ساتویں پارے کا ترجمہ ہے۔ سب سے پہلے ایک ایک لفظ کا الگ الگ ترجمہ درج کیا جاتا ہے اور پھر نیچے اُسے محاورے کی رعایت کے ساتھ تحریر کیا جاتا ہے۔ اگر اس سلسلے کا ذوق اور انہماک سے مطالعہ کیا جائے تو نہ صرف قرآن مجید کے مطالب اچھی طرح ذہن نشین ہو جاتے ہیں بلکہ عربی زبان سے بھی کسی حد تک مناسبت پیدا ہو جاتی ہے۔ خدا کرے کہ فاضل مصنف اس مفید سلسلہ کو پابندی کے ساتھ جاری رکھ سکیں۔ یہ حصّہ ۱۵۱ صفحات پر مشتمل ہے اور اس کی قیمت ڈیڑھ روپیہ ہے۔

کمیونزم یا اسلام؟ | تالیف: جناب ابوالسلام نعیم صدیقی صاحب۔ شائع کردہ: مسلم سوسائٹی ملتان۔ صفحات ۳۲۔ قیمت ۲۵ پیسے۔

جناب نعیم صدیقی صاحب کا یہ قابلِ قدر مقالہ چند ماہ پیشتر اسلامیہ کالج کی ایک تقریب میں پڑھا گیا تھا۔ اس میں بڑے سادہ اور دلنشین انداز میں کمیونزم اور اسلام کا موازنہ کیا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ اشتراکیت میں انسان کے اخلاق اور روح پر کیا گزرتی ہے۔ یہ مقالہ پہلے شائع ہو کر ملک کے سنجیدہ طبقوں سے خراجِ تحسین حاصل کر چکا ہے۔ اب مسلم سوسائٹی ملتان نے اس کی افادیت کے پیشِ نظر اسے بڑے اہتمام سے شائع کیا ہے۔ تبلیغی مقاصد کے لیے خریدنے والوں کو یہ ۱۵ روپے سینکڑہ کے حساب سے مل سکتا ہے۔

اعجازِ نطق حصّہ اوّل | تالیف: جناب ابوسعید حیرت جلالپوری تقسیم کنندہ: تعمیری کتب خانہ، اردو بازار، راولپنڈی۔ صفحات ۵۶۴ قیمت لائبریری ایڈیشن چھ روپے۔ خاص ایڈیشن آٹھ روپے۔

جناب ابوسعید حیرت صاحب ایک تجربہ کار معلّم اور سلجھے ہوئے ادیب ہیں۔ انہوں نے سکول کے بچوں کی تقریر کے انعامی مقابلوں کے لیے جو مواد فراہم کیا اُسے بڑے قرینے کے ساتھ قلمبند کر کے قارئین کے سامنے زیرِ تبصرہ کتاب کی صورت میں پیش کر دیا ہے۔ یہ ایک بڑا مفید سلسلہ ہے جو ہر لحاظ سے ستائش کا مستحق ہے۔

معیارِ کتابت وطباعت اچھا ہے۔

(بقیہ اشارات)

ملک میں امنِ عامہ جس تشویشناک رفتار سے غارت ہو رہا ہے اُس سے ملک کی پوری آبادی سخت مضطرب اور پریشان ہے۔ قتل، ڈاکہ، اغوا زندگی کے معمولات بن گئے ہیں اور سماج دشمن عناصر بلاخوف لوگوں کے جان، مال، عزت و آبرو سے کھیلتے پھرتے ہیں اور ان کی کثیر تعداد احتساب اور تعزیر سے بچ نکلتی ہے، اور پھر زیادہ دلیری اور بے خوفی کے ساتھ جرائم کا ارتکاب کرتی ہے۔ اس صورتِ حال نے عوام کا ذہنی سکون برباد کر دیا ہے۔ ہر شخص کو اس بات کا خطرہ لاحق رہتا ہے کہ اُسے کسی وقت بھی ظلم و ستم کا تختۂ مشق بنایا جا سکتا ہے۔ اُس کی، اس کے خاندان کے کسی فرد کی، بلکہ پورے خاندان کی کسی وقت جان لی جا سکتی ہے۔ کیونکہ انسانی جان کا احترام اب باقی نہیں رہا۔ اس کے ننھے منھے لختِ جگر کسی وقت بھی سنگ دل بردہ فروشوں کی سفاکیوں کا شکار ہو سکتے ہیں۔ اس کی بہو بیٹی کی کسی وقت بھی آبرو برباد کی جا سکتی ہے۔

معاشرے کے مختلف طبقوں کے درمیان بلاشبہ اختلافات پائے جاتے ہیں مگر اس معاملے میں کسی فرد کو بھی اختلاف نہیں کہ جب تک عوام اپنے جان و مال اور عزت و آبرو کو پوری طرح محفوظ و مامون محسوس نہیں کرتے وہ اپنی قوتوں کو تعمیر و ترقی کے کسی کام پر نہیں لگا سکتے۔ خاندان کے ان بدنصیب افراد کی بدنصیبی کا اندازہ کیجیے جو سماج دشمن عناصر کی ستم رانیوں کا شکار ہو کر اپنے ماں، باپ، بہن، بھائیوں کی محبت اور شفقت سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو گئے ہیں۔ یا اُن والدین اور اُن جگر پاروں کی مظلومیت کا تصور کیجیے جنہیں سفاک بردہ فروش ایک دوسرے سے الگ کر دیتے ہیں، ان ستم کشوں کی حالتِ زار دیکھ کر اور مظلومیت کی داستان سن کر کلیجہ شق ہو جاتا ہے اور ذہن میں یہ سوال ابھرتا ہے کہ کیا ان بے کسوں کے ان دکھوں کا معاشرے کے پاس کوئی مداوا نہیں؟ کیا انسانیت کے اندر باہمی ہمدردی کے سارے

سوتے بالکل سوکھ گئے ہیں ۔ کیا امنِ عامہ کے محافظ گہری نیند سو گئے ہیں ۔ انسانوں کی عظیم اکثریت آج بھی سکون اور آرام سے زندگی بسر کرنے کی شدید آرزو مند ہے ۔ اس عظیم اکثریت کی اس فطری خواہش اور آرزو کا آخر حقیر سی اقلیت کیوں خون کرتی ہے ؟ وہ آخر کیونکر بے لگام ہو کر لوگوں پر عرصۂ حیات تنگ کر رہی ہے ۔ آخر معاشرہ ، انتظامیہ اور احتساب کے دوسرے ادارے کیوں اس کے سامنے بے بس ہیں ۔

ہم خدا اور رسول کے نام پر ، انسانیت اور آدمیت کے نام پر ملک کے سارے باشندوں سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ اس اندوہناک صورتِ حال کا احساس کریں اور اس کے تدارک کی فکر کریں ۔ اگر وہ آج اس کی لپیٹ سے بچے ہوئے ہیں تو انہیں اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے اور ان بدنصیبوں کی معاونت و دستگیری کرنی چاہیے جو اس آگ کی لپیٹ میں آچکے ہیں اور اس کے ساتھ اس پر قابو پانے کے لیے پوری قوت سے آگے بڑھنے کی فکر کرنی چاہیے ۔ کیونکہ اگر اس میں ذراسی غفلت برتی گئی تو کوئی شخص بھی اس کی زد سے محفوظ نہ رہ سکے گا ۔

ہم اس ضمن میں امنِ عامہ کے محافظوں سے بھی پُر زور گذارش کرتے ہیں کہ وہ ان حالات سے نمٹنے کی فکر کریں ۔ ممکن ہے اس وقت اونچے مناصب اور وسیع اختیارات کے مالک ہونے کی وجہ سے وہ کوئی خطرہ محسوس نہ کرتے ہوں مگر اس تحفظ کی وجہ سے ان کے اندر انسانیت کا مشترک احساس تو نہ مرنا چاہیے ۔ انہیں اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر یہ دیکھنا چاہیے کہ اگر خدانخواستہ اُن میں سے کسی پر یہ قیامت ٹوٹ پڑے تو اُس کا کیا حشر ہو ۔

ہم سماج دشمن عناصر اور اُن کی بالواسطہ یا بلاواسطہ پشت پناہی کرنے والوں سے بھی بڑی دردمندی کے ساتھ یہ گذارش کرتے ہیں کہ تم براہِ کرم اپنے طرزِ عمل پر غور کرو ۔ کمزوروں اور بے بسوں کو ستانا ، انسانی جان اور لوگوں کی عزت و آبرو سے کھیلنا ایسے گھناؤنے جرائم ہیں جنہیں مذہب ، اخلاق اور انسانیت نے ہمیشہ شدید نفرت کی نگاہ سے دیکھا ہے ۔ اگر تمہارے پہلو میں تمہارے دل بالکل پتھر نہیں بن گئے تو تمہیں ان لوگوں کے دکھوں کا احساس اور ان کے مصائب کا تصور کرنا چاہیے جو تمہاری وجہ سے اُن پر ٹوٹتے ہیں ۔ ذرا اپنے آپ کو اُن کی جگہ رکھ کر سوچو کہ اگر تم اِن مظالم کا شکار ہوتے تو تم پر کیا

گزرتی۔ یاد رکھو کہ مظلوم کی آہ سے عرش ہل جاتا ہے۔ اس چند روزہ زندگی میں اگر تم نے دوسروں کو ستا لیا تو اس کا کوئی خمیازہ نہ بھگتنا پڑے گا؟ آخرت کی ابدی زندگی میں تم اس سے کہیں زیادہ ستائے جاؤگے اور یہ ضروری نہیں کہ تم اس دنیا میں ہر حالت میں محفوظ رہو۔ جب ظلم کی پرورش ہو رہی ہو تو پھر ایک سے دوسرا بڑھ کر ظالم اٹھتا ہے اور وہ اُن ظالموں کو اپنے تشدد کا نشانہ بناتا ہے جن کی عمریں سفاکی اور زیر دست آزاری میں گزری ہوں۔
